

# اصغر اکبری

ہلانے لگیں۔ بچپن سے بے کوا بے کی دھمکیاں اور ڈراوے دیتے دیکھتی چلی آرہی تھیں اور بچپن سے ہی جانتی تھیں کہ یہ دھمکیاں محض دھمکیاں اور یہ ڈراوے نرے ڈراوے ہی ہیں اب اتنا ہی بے ضرر تھا جتنا کہ گھر کا دوسرا بے جان سامان۔

”با جی جان! آپ یہ والا راجستھانی لہنگا۔۔۔“

”اوائے“ تجھے تین دفعہ کہہ چکی ہوں یہ با جی با جی کیا لگا رکھا ہے۔“ اکبری نے سیلزمین کو بری طرح لتاڑ کے رکھ دیا۔

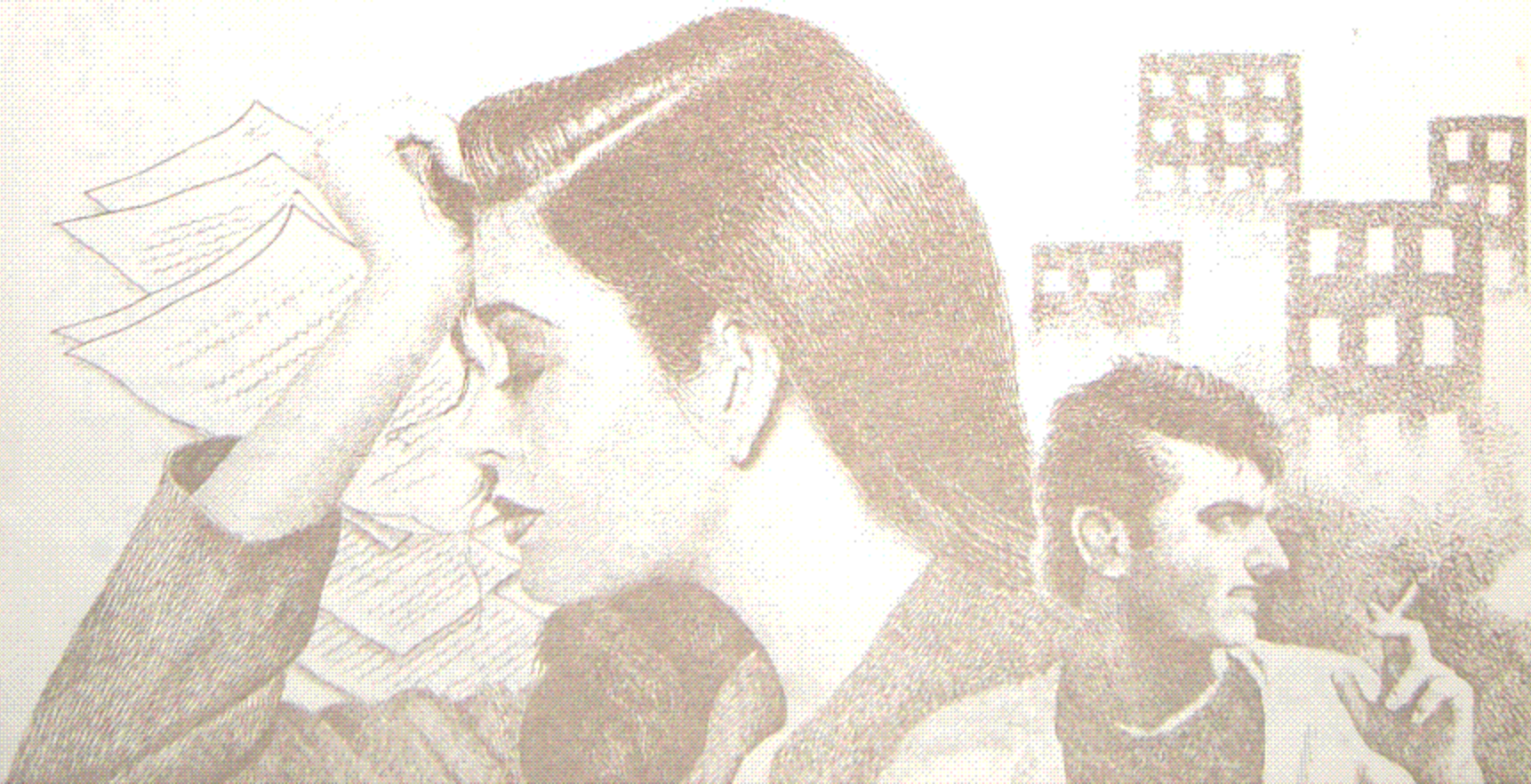
”دیکھ ذرا بے بے! چنگا بھلا مونچھ واڑھی والا پائی (بھائی) ہے اور کا کا بن کے مجھے با جی کتا جا رہا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے“ اس سے کوئی چھ سات سال چھوٹی

”چلو کڑیو، شاوا۔۔۔“ بے نے اکتاہٹ بھرے انداز میں سامنے پڑے جھلمل جھلمل کرتے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھا اور اپنی دختران کو ٹھوکا دیا جو بڑے انہماک اور دلجمعی کے ساتھ بچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اسی ایک دوکان پہ جم کے بیٹھی اپنے ملبوسات منتخب کرنے کے مرحلے سے دوچار تھیں۔

”چھتی کرو، ظہریلے کے گھر سے نکلے ہیں“ ڈیگر (عصر) ویلا ہو گیا ہے اور ابھی تک کچھ پسند نہیں آیا تم دونوں کو۔ پتا بھی ہے کہ ہر حال میں مغرب ویلے سے پہلاں پہلاں گھر پہنچنا ہے ورنہ اپنے پیو کا پتا ہے نا۔“

”یتا ہے پتا ہے۔“ دونوں یک زبان ہو کے ہاتھ

## ناولٹ





ہوں گی۔" اس نے دھڑلے سے اٹھارہ انیس سال کے نو عمر لڑکے اور اپنے درمیان عمر کا مبالغہ آمیز فرق بتلایا۔

"آپ تو ناراض ہی ہو گئیں چھوٹی بہنا! چلیں غصہ تھوک دیں۔ بڑے موڈ کے ساتھ اچھی شاپنگ نہیں ہوتی۔ اچھا یہ ریڈ کلر کا لنگا تو دیکھیں۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" اس نے ناک چڑھائی، پھر اصغری کو ٹھوکا دیا۔

"کیوں نکی تیرا کیا خیال ہے؟"

"میں نے کہا، اچھا ہے تو ٹوٹ پرے پھینک دے گی۔" اس نے صاف گوئی کی انتہا کر دی۔

"دیکھ ورا! پہلے ہی بتایا تھا دونوں بہنوں کو اکو جیسے لہنگے چاہئیں۔ کوئی ایسا رنگ دکھا جو میرے ساتھ ساتھ میری نکی یہ بھی اٹھ جائے۔" اس کے لیے میں بے یقینی سی تھی جیسے نکی پہ کسی رنگ کا "ٹھنڈا" ناممکنات میں سے ہو۔

"ہاں اس رنگ میں کیا برائی ہے؟" سب سے بڑا چارہ چڑھ گیا۔ یہ تو ہے ہی وہ بیٹوں والا رنگ۔"

"ہاں بے بے! دیکھ ناں یہ سو ہارنگ میرے ساتھ رنگ پہ تو بڑا اٹھے گا پر اپنی نکی کا میلا رنگ۔ ایسا لگے گا جیسے تندور بھڑکا کے رکھا ہو۔"

اس کھلی بے عزتی پہ اصغری نے واک آؤٹ کا ارادہ کیا۔

"چل بے بے! میں نے تنس کچھ خریدنا۔ باجی کی تو عادت ہے ہر جگہ مجھے ذلیل کرنے کی۔ بڑا مان ہے اپنی پھکی چمڑی پہ۔" اسے جب بھی تاؤ آتا اسے سر عام باجی کہہ کے بھڑاس نکالا کرتی۔

"ہائے، ہائے، سیاہ۔ کتنا کہا تھا ان کے پیو کو۔ پچھلے پچیس سال سے دونوں کے دن گل ختم نہیں ہوئے۔ انہیں ایک گھر میں نہ بھیجنا۔ اگلی ساری حیاتی بھی لڑمر کے گزاریں گی۔ ان کا گزارا نہیں ہونے والا ایک ساتھ، پر اس بھلے ماس نے آج تک میری مانی ہے جواب ماننا۔"

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس ایک طرفہ فیصلے کا سہرا اٹنے کے سر پاندھا گیا جو تمام کارروائی کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ بے بے کا اپنا فیصلہ تھا کہ "جنگ" (بارات) ایک گھر سے آئے گی تو روٹی کا خرچہ کم ہوگا اور اس خرچے کو بچانے کے لیے دونوں کو ایک ہی اکھاڑے میں انار نے کابند و بست کیا جا رہا تھا۔ روز کی طرح آج بھی شاپنگ کے نام پہ نکلی تینوں ماں بیٹیاں خالی ہاتھ لٹکائے فروٹ چاٹ، برگر اور ٹھنڈی بوتلیں حلق تک بھر کے اچھرے بازار سے واپس لوٹ رہی تھیں۔

"ناک کی سیدھ میں چلنا اب دونوں۔ خبردار جو رستے میں کسی کی دکان پہ رکیں۔ سیدھی ویگن کے اڈے تک پہنچو۔" بے بے کی سخت وارننگ پہ وہ دل چاہنے کے باوجود دس روپے والے جیولری آئٹمز کے ٹھیلوں پہ رک نہ سکیں۔ اوپر سے اچھرے کے چرب زبان دکانداروں کے آواز آئے۔

"آئی۔ کر لو چھانٹی۔"

ایک کراری سی آواز نے فٹ پاتھ پہ بکھرے لان کے "ٹوٹوں" کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چھانٹی کی آفر دی۔

"فح دور۔ چٹا جھانٹا تے عقل دا گھانا۔ آئی ہوگی تیری ہوئی سوتی۔" بے بے کو وہی طیش آیا جو اکبری کو "باجی" سن کے آیا تھا۔

"خالہ عنایت! کروں گا رعایت۔"

اس آواز پہ بے بے ٹھٹک کے رکیں۔

"بے غیرنا، سر عام میرا نام اونچی آواز میں پکارتا ہے۔ اکبری کے پیو کا پتا ہے۔؟ یہ جو ڈیڑھ ڈیڑھ انچ کے پیلے دانت ہیں ناں، اک چھپو (طمانچہ) مار کے ہاتھ پہ رکھ دے گا۔"

"واقعی خالہ۔! پھر تو ضرور بلانا خالو کو۔ دانتوں کا ڈاکٹر تو بڑے پیسے مانگتا ہے۔" لڑکا شاید ضرورت مند تھا یا ضرورت سے زیادہ ڈھیٹ۔

"ہائے میں مر جاواں اتنی سستی سینڈ لیس۔"



جو توں کی دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے ایک سبز زمین نے اچانک ان کے سامنے آکر دلدوز چیخ کے ساتھ اپنی ”سینڈلوں اور اپنے فن“ کی پبلیٹی کی۔ یہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کا اس کا اپنا اسٹائل تھا مگر اپنے دھیان میں مگن اصغری گڑبڑا کے پیچھے سے آتی اکبری گرتے گرتے بچی مگر ڈھائی انچ کی ہیل پہ چڑھی اکبری بچ نہ سکی۔

”تیرا بیڑا ہی غرق نا مراد۔ اگر میری دھی کو کچھ ہو جاتا تو تیری دکان میں شوکیسوں میں سچی ساری کی ساری جوتیاں نکال کے میں نے ایک ایک کر کے تیری ٹڈیہ بجا دیتا تھیں۔ اونہ رو تے دکانداری کرنے کو۔ بھانڈ کھیں کے۔“

”بے بے! مچھی پکوڑے۔“ چٹوری اکبری نے اچھرے موڑ کے مشہور مچھلی کی دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے فرمائش کی۔

”چسکورے کھانے کی طرف دھیان ہے سارا۔ بازار آتی ہی چسکے کے لیے ہے۔ ویاہ میں مہینہ بھی نہیں رہ گیا اور لیرے لے (کپڑے) کا کچھ پتا نہیں۔ چل سیدھی طراں آگے لگ۔ ویگن نکل گئی تو رکشہ لینا پڑے گا۔ مفت میں چالیس روپے بریاد ہوں گے۔“ گھر کے نزدیکی ”بھلہ اسٹاپ“ پہ اتر کے جیسے ہی دونوں ”بابا مرندھے والا“ کے مزار کے ساتھ والی گلی میں مڑیں، بے بے کو دونوں کی بے پردگی کا خیال آیا۔ فننگ والے ساٹن کے برقعے کس کے بٹن لگا کے چڑھائے گئے تھے۔ اوپر کا حصہ یوں سر پہ ٹانگا گیا تھا کہ بالوں کے شیم آرا اسٹائل والے پف اور کلپ لگے نظر آتے رہیں۔

”نقاب نیچے گراؤ کڑیو اپنے پو کا پتا ہے نا۔“  
”پتا ہے۔ پتا ہے۔“ دونوں نے برقعے کے ”شیر“ کراتے ہوئے کہا۔



اکبری اور اصغری کے دن کیا مقرر ہوئے تھے مانو

پوری برادری میں جیسے ”تھر تھلی“ مچ گئی تھی۔ تنھیال، دوھیال سب کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ بڑی مائی نے تو منت مان رکھی تھی، جیسے ہی دونوں کی بات کی ہونے کے چار لڈوان کے گھر آئے، انہوں نے محلے بھر میں چار کلو لڈو بانٹے۔ تائی نے شکرانے کے سونفل پڑھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ماں سے بڑھ کے مائی اور تائی کو خوشی ہوئی تھی ان کے گھر بس جانے کی۔ بلکہ یہ منت کے لڈو شکرانے کے نوافل و حقیقت ان کے ٹھکانے لگ جانے اور اپنے بچاؤ کی خوشی کے تھے۔

یوں تو عنایت بی بی نے خاندان بھر میں کوئی گھر ایسا نہ چھوڑا تھا جہاں وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کوشش نہ کر چکی ہو مگر اپنی بڑی جیٹھالی اور بھانج کے سپوتوں پہ اس کی خاص نظر تھی۔ تائی نے تو اپنے لاڈلے کو حفظ ما تقدم کے طور پہ کویت بھجوا دیا، یہ کہہ کر کہ جب تک اکبری کی ڈول نہ اٹھ جائے، واپس لوٹنے کا نام مت لیتا، اوہر دیور دیورانی کے دباؤ پہ سالوں سے یہی عذر پیش کیا گیا کہ انور بے چارے کا دل تو کرتا ہے آنے کو مگر اگلے دس سال تک شاید ہی آپائے، تمہیں لڑکی اتنی بھاری ہے تو ٹھیک ہے نیلی فون پہ نکاح پڑھا کے رخصت کروا لیتی ہوں جب تک انور تمہیں آنا، بیٹی بن کے میری خدمت کرے۔“ اور عنایت بدک جاتی۔ اکبری کی زبان درازی اور خوش خوراک سے بھلے اسے سو گئے ہوں، مگر بھی تو بیٹی، کیسے بارہ من کی، گٹھیا کی مریضہ بھانج کے گھر ملازمہ بنا کے بھیج دیتی جس کا تین بیابا، دو کنواری بیٹیوں اور تین لڑکوں کا بڑا سا ٹبر تھا۔

مائی نے اکبری سے بچنے کی خاطر یہاں تک بدنامی مول لی کہ بڑے بیٹے کو نشے کا عادی جبکہ چھوٹے کو مار کٹائی کا شوقین مشہور کر دیا۔

دور پرے کے رشتے داریوں بھی پٹھے نہ ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے۔ اکبری کی وجہ سے اصغری بھی بیٹھے بیٹھے پچتیس کی ہونے کو آئی حالانکہ اس پہ برادری والوں کو ذرا کم اعتراضات تھے۔ وہ اکبری کی طرح ہمہ



وقت ٹھونسنے کی شوقین نہ تھی نہ ہی اس کی زبان کے آگے خندق تھی۔ بلکہ خاندان کی چھوٹی بڑی تقریبات میں وہ خود کو ڈپٹی نذیر احمد والی سچ مچ کی اصغری ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی۔ بڑی بوڑھیوں کی زبانی کلامی چالپوسی کرنا ان سے رغبت سے بہوؤں کی غیبتیں سننا اور خاندان کی بھابیوں سے ان کی ساسوں کے مظالم آنکھوں میں آنسو بھر کے سننے میں اسے خاص مہارت تھی۔

پھر اکبری کی نسبت بڑھی لکھی بھی تھی۔ بے شک میٹرک کا امتحان باوجود کوشش کے تیسری بار بھی پاس نہ کر سکی تھی، مگر چونکہ اسکول میں دس جماعتوں کی فیس بھر چکی تھی اس لیے دھڑلے سے خود کو ”تجربہ کار“ میٹرک پاس بتلاتی۔ جبکہ اکبری نے تو ساتویں جماعت تک جا کے تب ہی ہمت ہار دی تھی جب اسی اسکول کی دسویں کی ”باجیاں“ بھی ساتویں جماعت کی اس انیس سالہ اکبری کو استانی جی سمجھ بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد گزشتہ نو سالوں سے وہ گھر بیٹھی اپنے حسن اور صحت دونوں کے نکھار میں مصروف تھی۔ اسے اپنی گوری رنگت پر بڑا ناز تھا جو بلاشبہ ہونا ہی چاہیے لیکن اسے اپنی شخصیت کی ان چیزوں پر بھی کمال درجے کا غرور تھا جس پر غرور کرنا بذات خود ”غرور“ کی توہین تھی۔

مثلاً اپنے ٹھگنے سے قد پر اسے بابہ شریف ہونے کا زعم تھا۔ حالانکہ بابہ شریف پچاس سال کی عمر میں بھی اتنا ”پکا“ چہرہ نہیں رکھتی جتنا اکبری کا پندرہ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ اپنی چندی مندی آنکھوں پر اسے ریشم کے منیوں کا گمان ہوتا، اپنی قابل رشک صحت کی وجہ سے وہ خود کو ”کڑی پنجابن“ یعنی صائمہ قرار دیتی حالانکہ اگر صائمہ اسے دیکھ لیتی اور اس کا یہ دعوا بھی سن لیتی تو ہتک عزت اور کم از کم کروڑ روپے ہرجانے کا جوابی دعوا کر دیتی۔ البتہ آواز کے بارے میں اس کا دعوا بے بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ بقول اکبری کے جس طرح مہدی حسن کے گلے میں

بھگوان بولتا ہے، اسی طرح اس کے گلے میں نصیبو لعل چٹکھاڑتی ہے۔ اس کی اس بات پر تب ایمان لانے کو جی چاہتا۔ جب وہ آٹا گوندھتے ہوئے گنگنائی۔

”بکل سے وچ چورنی میری بکل دیے وچ چور۔“  
عنایت بی بی کو قطعی امید نہیں تھی کہ ان کی یہ اٹھائیس سالہ بیٹی جو خیر سے بد مزاجی زبان درازی ہاتھ پائی اور کام چوری جیسے گنوں میں بھی پوری تھی اس کے لیے حاتم جیسے انسان کا رشتہ آسکتا ہے۔ ابھی وہ قسمت کی اس مہربانی پر بوکھلائی ہوئی تھی کہ رشتہ لانے والی وجولن جو در حقیقت لڑکے کی دور پرے کی ماسی بھی تھی اس نے حاتم سے چھوٹے والے لقمان کے لیے اصغری کا نام لے لیا۔ اب تو جی عنایت بی بی کی لاٹری نکل آئی۔ مارے خوشی اور جوش جذبات کے اس نے اپنے مجازی خدا کو دو ہتھڑے مارے۔ بے چارہ کھانسی کے دورے سے نمٹ کے اس ”پر محبت لمس“ کی وجہ دریافت کرنے لگا جس نے اس کی پسلیاں تک ہلا ڈالی تھیں۔

”یہ تیری کوئی نیکی تھی۔ پتا نہیں تو نے ساری حیاتی کوئی نیکی کی بھی تھی یا نہیں، ہو سکتا ہے تیرے پچھلوں کی کوئی نیکی ہو جو میری شکل میں تیرے آگے آگئی ورنہ تیری ایسی قسمت کہ تجھے مجھ جیسی زنانی ملتی؟ یہ میرے نصیب اور میری عقل ہے کہ آج تیری بیٹیوں کے لیے اتنے اچھے رشتے مل گئے۔ بڑا والا ڈاک خانہ میں ملازم ہے تو چھوٹے کی دودھ دہی کی دکان ہے۔ اپنا مکان ہے اور سب سے اچھی بات دونوں کے ماں پو سالوں پہلے ہی مک مکا گئے۔“

”چلو اچھی بات ہے اکبری، اصغری کو زیادہ محنت نہ کرنا پڑے گی۔“ بے چارے کو یاد آیا کہ کس طرح عنایت بی بی کو پورے آٹھ سال لگے تھے اس کی ہنسی کٹی ماں کو بستر پہ ڈالنے میں۔

”اور دونوں بہنیں اکو وہ ہڑے (آنگن) میں اتریں گی۔“

”اللہ خیر کرے اس وہ ہڑے کی۔“ بابل کو بیٹیوں



کے سسرال آنگن کی اینٹ سے اینٹ بجتی ابھی سے نظر آنے لگی۔

”کبھی تو میری بیٹیوں کے بارے میں اچھا سوچ لیا کرو۔“

”بھلے لو کے، اک گل تے بتا، کبھی یہ تیری بیٹیاں ہو جاتی ہیں، کبھی میری۔ پہلے یہ تو طے کر لے کہ ان کی کون سی عادت کس کے کھاتے میں ڈالنی ہے۔ اچھا ہو تو سب تیرا۔ جو برا ہے وہ میرے نام لگا دیا کرو۔“

”ہاں تو یہی دستور ہے، داد کوں (دوھیال) کا اثر آتے دیکھا تو تیری بیٹیاں۔ اور اگر نالگوں (ننھیال) کے گن دیکھے تو ظاہر ہے میری بیٹیاں۔ اچھا اب یہ تیری میری چھوڑ۔ کام کی بات کر، کوئی چیز کی لینے دینے کی۔ منڈوں کے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں جو چیز میں منہ پھاڑ کے فرمائش کرے یا نقص نکالے، پھر بھی دینا تو اپنی اولاد کو ہے، اس کے ہی کام آئے گا، جتنا بن سکا ضرور دیں گے۔“

”ہاں تو اپنی کون سا اور اولاد بیٹھی ہے جو ہے ان دونوں نمایوں کا ہی ہے۔ ایسا کرتا ہوں، کاموں کے والی زمین بیچ دیتا ہوں، زیور بن جائے گا۔ اور پار سال وڈے پانی جان۔ نے دادا جی کے جو دو مرتبے بیچ کر میرے حصے کے پینتیس ہزار دیے تھے وہ بینک میں پڑے ہیں، ان سے چنچ (بارت) کی روٹی پانی کا بندوست ہو جائے گا۔ باقی رہ گیا فرنیچر۔ یعنی مسہری، سنگھار میز، کرسیاں وغیرہ۔“

”اور ٹی وی، فریج، بھول گیا۔ نا کبری کا گزارہ فریج کے بغیر تو نا اصراری کا ٹی وی کے بغیر۔ وہ تو ان دونوں چیزوں کو لیے بغیر ڈولی میں نہ بیٹھیں گی۔ اس کے علاوہ کپڑے لے، میک اپ شیک اپ کے لیے بھی ہزاروں چاہئیں۔“

”اتنا پیسہ تو میرے پاس نہیں۔ مشکل سے پچاس ہزار نکلیں گے، بسترے اور فرنیچر بنالے چاہے لی وی ٹی وی لے لے۔ سارا کچ تو پورا نہیں پڑے گا ان پچاس ہزار میں۔“

”ہائے۔ تو کیا میری کڑیاں ترسیں گی ان چیزوں کے لیے؟“

”ہائے۔ تو کیا میں اپنی ہٹی (دکان) بیچ کے واج پورا کروں تاکہ باقی عمر خیرات لے کے کھانا پڑے۔ اوکو تو میری روزی روٹی کا آسرا ہے۔“

”تو فکر نہ کر، میں دماغ لڑاتی ہوں۔ آخر عقل مند زنانی ہی کام آتی ہے۔“ اور عنایت بی بی نے ایسا دماغ لڑایا کہ سارا انتظام تقریباً ہو گیا۔ وہ اگلے چکر میں بیٹیوں کے ہونے والے سسرال گئی تو سارے گھر میں گھوم گھوم کے جائزہ لیا۔ پانچ مرلے کا اچھا بنا ہوا مکان تھا۔ نیچے بیٹھک کے علاوہ دو کمرے، برآمدے، باورچی خانہ اور چھوٹا سا پکا صحن تھا۔ اوپر ایک برساتی نما کمرہ تھا جو اسٹور کا کام دیتا تھا۔

”دیکھ پتر! مجھے غلط نہ سمجھنا، میری کڑیوں کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی۔ مگر تم دونوں یہ ہامی اس لیے بھری کہ ثواب کا کام ہے کسی یتیم کا گھر آباد کرنا۔ میری

• گرتے بالوں کو روکتا ہے • نئے بال اگاتا ہے • بال بے اور گھنے کرتا ہے • بیوٹی بکس کا تیار کردہ

## سوہتی ہیٹ آئل

پچھلے 25 سالوں سے ہینڈ اور تھائی استعمال کر رہے ہیں



سوہتی ہیٹ آئل کے بعد آپ کے حسن کے لیے بیوٹی بکس کا قدرتی جی بیوٹیوں سے تیار کردہ

## سوہتی ایڈن

(ہیر بلے بیوٹی پیاؤڈر)

جو آپ کو حسین سے حسین تر بنائے

• رنگ نکھارے، چہرے کو خوبصورت بنائے، چہرے کا رنگ بدل کر صاف اور شفاف بنائے

سوہتی ایڈن، چہرے اور ہاتھوں کی خوبصورتی کا راز

یہ آپ کے چہرے کو قدرتی حسن، ہلاکت اور دلکش بنائے، چہرے کے داغ دھبے، آدھ کی جگہ کے بند سمکھوں کو اچھائی سے چھپاتا ہے، آپ کے چہرے کو دلکش لالہ لالہ کی صورت دے گا اور مسدود زون

• ہیر بلے، آپ کا رنگ بگاڑنے کا اور ہر کوئی آپ کو کاندھے پر نہیں دیکھ سکا ہے

• سوہتی ایڈن کا استعمال

• مکتبہ عمران ٹرانسٹ • بیوٹی بکس (کوئٹہ، لاہور، اسلام آباد، کراچی، راولپنڈی، پشاور، ملتان، فیصل آباد، گجرات، سندھ، بلوچستان، خیبر پختونخوا، گلگت بلتستان، آزاد کشمیر، شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان، فوجی علاقے، پاکستان) • 37 آرڈر ڈار کراچی • 37 آرڈر ڈار کراچی • 37 آرڈر ڈار کراچی



بھی پچھلے کچھ معاملات کی طرح کھٹائی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد اس نے خاندان کی ہنگامی میٹنگ طلب کی۔

”بھئی سارے جانتے ہیں، پچھلے تیس سالوں سے میں میکے اور سوہروں (سرال) کی چار درجن شادیاں، منگنیاں، پچاس کے قریب عقیقے اور ساگر اپن نمٹا چکی ہوں۔ خیر سے ساروں نے بچے بھی دل کی بھڑاس نکال کے پیدا کیے ہیں جبکہ مجھ بے چاری کی چونکے کی دو بیٹیاں۔ اگر میں حساب کرنے بیٹھوں تو فی بجہ تم ساروں کی طرف پانچ پانچ ہزار تو ہوتے ہیں ادسٹھے کی صورت میں میں نے الگ دیے ہوں گے۔“

”کیوں برہا پے میں چٹے چونڈے کے ساتھ اتنا چٹا جھوٹ بولتی ہو بھر جانی! انیس سو ننانوے تک تو پچیس روپے لفافے میں ڈال کر دھڑلے سے دیتی رہی ہو۔ ہاں اکیسویں صدی شروع ہونے کے بعد ذرا شرم آئی تو نیوٹے کی رقم پچاس روپے کر ڈالی۔“ اس کی چھوٹی ہند نے تڑپ کے کہا جو اپنی ساری اولاد سن دو ہزار کے آنے سے پہلے بیاہ چکی تھی اور جسے نیوٹے کی رقم میں سے نصف کے نقصان کا برا قلق تھا۔

”اچھا۔۔۔ اور تحفے۔۔۔؟“ اس نے چمک کر حتمایا۔  
”ہاں ہاں، بڑے تحفے۔ سکی بھانجیوں کو جو جوڑے تو نے جینز میں رکھنے کو دیے، ان کی وجہ سے اب تک میری بیٹیوں کو سرال والے طعنے دیتے ہیں۔“ عنایت بی بی کے چھوٹے بھائی کو بھی یہ دکھ تھا۔  
”تم طعنوں کی بات کرتے ہو ویر!“ اب کے بڑی بھانج نے دوپٹہ آنکھوں پہ ڈال کے سکنا شروع کر دیا۔

”میری بچی کو تو طلاق ہوتے ہوتے بچی، اس کی میاں کو سلامی میں پشاور کی چپل پیک کر کے دے دی اور وہ بھی اپنے بندے کی استعمال شدہ، کئی سال پرانی۔“

”میرے گھر پہلا پوتا (بوتا) ہوا تو تحفے کے طور پہ ڈھائی روپے والی چوٹی دے گئی۔“ یہ عنایت بی بی کی

اکبری، اصغری کا کیا ہے ان کو تو اچھے سے اچھا رشتہ مل جاتا۔ نہ تم دونوں کے ماں پو، نہ کوئی اور بڑا۔۔۔ لے دے کے بس دو ہی بھائی، بیویاں آپس میں نباہ نہ کر پاتیں تو تم دونوں تو کسی ایک رشتے سے بھی جاتے۔ اب میری کڑیاں دونوں سگی بہنیں دونوں میں اینٹ کتے کا۔۔۔ میرا مطلب ہے طوطا مینا کا پیار ہے۔ دونوں کی محبت تمہارا گھر بنائے رکھے گی۔ میں چاہتی ہوں اس گھر میں کوئی تیرا میرا والا چکر نہ ہو۔ خیر سے اس کمرے میں جونی۔ وی پڑا ہے وہ تم دونوں میں سے کس کا ہے؟“

”خالہ جی! ہمارا اپنا ہی ہے۔ قسطوں پہ لیا تھا، کبھی پائی جان نے قسطیں بھر دیں، کبھی میں نے۔“ لقمان نے جواب دیا۔

”ہاں تو اسے اس کمرے سے نکال کر برآمدے میں رکھ دو اور بیٹھک کا پرانا صوفہ بھی ادھر نکال دو۔ بیٹھک میں تو جینز کا نیا صوفہ آہی جائے گا۔ ذرا تم لوگوں کا برآمدہ نئے فیشن کا اور اٹھنے بیٹھنے کے لائق ہو جائے گا۔ میں تو چاہتی ہوں دونوں بھائی اور وہ دونوں بہنیں مل جل کے اس گھر میں رہیں۔ کتنا اچھا لگے گا جب اپنے اپنے کمرے میں الگ الگ بیٹھنے کے بجائے دونوں جوڑے اکٹھے ادھر برآمدے میں بیٹھ کے ٹی وی دیکھو گے ویسے بھی میں نہیں چاہتی کہ اکبری اصغری جینز کی چیزوں پہ اکڑ کے آپس میں لکھی پیدا کریں اسی لیے سوچ رہی ہوں فریج بھی نہ لوں۔ کل کو وڈی، نکلی سے یہ نہ کہے یہ میرے جینز کا ہے، وہ کہے، ہمیں میرے جینز کا، بس تم لوگ ایسا کرو، قسطوں پہ فریج بھی لے ہی لو۔ اور قسطیں اکٹھی ہی بھرنا تاکہ تمہاری زنانیاں اک دو سری کو یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ تیرے نہیں میرے میاں کی کمائی کا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“

لقمان تو جھٹ باچھیں چیر کر اثبات میں سر ہلانے لگا، البتہ حاتم پر سوچ نگاہوں سے عنقریب ہونے والی ساس صاحبہ کی عیاریاں ملاحظہ فرما رہا تھا۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر اللہ اللہ کر کے چالیس سال کی عمر میں شادی ہونے جا رہی تھی، چند ہزار کے بدلے اس معاملے کو



سگی بہن تھی۔

”چل نی۔ ڈھائی روپے۔؟ پورے نو روپے کی تھی۔ چنکی طراں یاد ہے مجھے اور کرایہ خرچ کر کے آنا جانا یہ سب یاد نہیں ہے اور پھر تم لوگوں کے گھر ویاہ ہوتے تھے، نئے کپڑے تو ہمیں بھی بنانا پڑتے تھے۔ دونوں کڑیوں کے ہر فنکشن کے لیے نئے جوڑے، میک اپ ہار بندے۔۔۔ یہ خرچ کیا کم تھا۔“

”اب چاہتی کیا ہو عنایت بہن! اتنا چھٹا تھا خرچا، تو نہ آتی برادری کی خوشیوں میں شریک ہونے۔“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں نے تم سب کے آدھ آدھ درجن بچوں کی خوشیاں بھگتائی ہیں۔ میری دونوں کڑیوں کی شادی ساتھ ہے۔ اب مجھے پورا حساب کتاب چاہیے۔ سلامی تم لوگوں نے جو دینی ہے، دو لمے کو دینی ہے مگر چاہتے مائے ہو تمہاری اپنی بیٹیاں ہیں، دل کھول کے کھنے دینا اور وہ بھی ایسے کھنے جو جینز میں رکھے جاسکیں۔ یہ لسٹ ہے جس کو جو وارے کھانا ہے وہ اپنا نام لگا لے۔“

زبردستی کی اس وصفی پہ سب کو تاؤ تو بہت آیا مگر بہر حال اکبری، اصغری سے سب کا کوئی نہ کوئی رشتہ تھا۔ عنایت بی بی کو دل ہی دل میں صلواتیں سناتے سب نے کھنے دینے کی ہامی بھری لی۔ بڑے تایا کے حصے میں واشنگ مشین آئی تو پھونٹے تایا کے حصے میں ڈزریٹ اور دائریٹ۔ چچا کے ذمے کبیل اور کھیس لگائے گئے۔ بڑی پھوپھی کو رضائیاں بنوانے کو دی گئیں۔ چھوٹی پھوپھی نے بمشکل واٹر کولر پہ ہامی بھری۔ ننھیال والوں کے ذمے کم بار نہ تھا۔ کسی کو سلائی مشین، کسی کو بیڈ شل فین، کسی کو لوہے کی الساری تو کسی کو استری کا کہہ دیا گیا۔ یوں جینز کا چیدہ چیدہ سامان اکٹھا ہو ہی گیا، چاہے زبردستی ہی سہی۔

اب اکبری، اصغری ابے کے لیے پچاس ہزار کو اپنی مرضی سے خرچے کی مختار تھیں، مگر براہو دونوں کے مزاج کا۔ آج آٹھواں دن تھا، بے بے کے ساتھ بازار جاتے ہوئے مگر شاہ عالمی، دلی دروازہ، بانو مارکیٹ اور اچھرے کی ساری گلیاں چھان مارنے کے بعد بھی

دونوں ایک دوپٹہ تک خریدنے کے معاملے میں متفق نہ ہو سکیں۔ اکبری نے شوشہ چھوڑ رکھا تھا کہ ساری چیزیں ایک جیسی ہونی چاہئیں۔ اب وہ کچھ پسند کرتی تو اصغری لینے سے انکار کر دیتی۔ اسے پسند آتا تو اکبری کو اعتراض ہوتا۔ نویں دن عنایت بی بی کو جلال اٹھا۔

”سنا نکلیں چیر کے رکھ دوں گی اب میرے ساتھ کوئی بازار گیا تو۔ روز کرائے اور کھانے پینے پہ سو دو سو نکل جاتا ہے۔ لیتی دیتی کلکھ بھی نہیں۔ میں آئے کرلوں گی ساری خریداری۔ پتہ ہے مجھے آج کل کے فیشنوں کا۔“

یہ دھمکی کارگر رہی کیونکہ وہ دونوں جانتی تھیں، بے بے کو فیشن کا کتنا پتہ ہے۔ اگلے دن شرافت سے کڑھائی اور مینا کاری کے لیے سوٹ دے دیے گئے۔ دوپٹے رنگوائی والے کو دیے گئے۔ بڑا مرحلہ عروسی جوڑے کا تھا۔ اصغری آخر اصغری تھی، اسے اپنی مرضی چلانے کے ایک سو ایک طریقے آتے تھے۔ اس نے بینکنی رنگ کے شرارے کا شور مچا دیا۔ جانتی تھی کسی فیشن میگزین کے کورپہ گوری جیٹ نازک سی ماڈل کو اسی رنگ کے عروسی لباس میں ملبوس دیکھ کر اکبری کافی دیر تک للچائی نظروں سے دیکھتی رہی تھی، لیکن ادھر اصغری نے نام لیا، ادھر اکبری کے دل سے جوڑا اترتا۔

”تیرا تو دماغ پھر گیا ہے نکلی! ذرا اپنی شکل ششے میں دیکھ۔ تو اس رنگ کا غرار اپنے کی؟ اری بینکن لگے گی، وہ بھی لمبوتر۔ چل میرے گورے بدن پہ تو یہ رنگ سج اٹھے گا مگر تو۔۔۔ چہ چہ۔۔۔ میں نہیں چاہتی شادی والے دن تیرا مذاق بنے۔“

حالانکہ اس سے پہلے اس کی سو فیصد مرضی اسی پہ تھی۔ اس کی بلا سے اصغری کا مذاق بنے چاہے تماشا۔ ریڈ کلر کے بارے میں وہ پہلے ہی اعلانیہ مخالفت ظاہر کر چکی تھی۔ بالآخر ڈارک میرون اور فلان کلر کے کنٹراسٹ پہ اتفاق رائے ہوا۔

”یہ رنگ بڑا بھرم والا ہے۔ گورے پہ تو اٹھتا ہی ہے، کالے کو بھی تھوڑا بہت نکھار دیتا ہے۔“ یہ اس کی



رائے تھی جس پہ بظاہر ناک بھوں چڑھاتی اصغری دل سے متفق تھی۔ ویسے بھی اس کا رنگ کالا ہرگز نہ تھا، گندمی مائل سانولا سا تھا۔ فلمی ستاروں والے صابن سے رگڑ کے دھونے کے بعد تو خاصا صاف لگا کرتا۔ البتہ صفائی ستھرائی، کھانا پکانا وغیرہ جیسے کاموں سے ادھ موٹی ہونے کے بعد اس کی رنگت ضرور سنولائی ہوئی لگتی مگر کیا کرتی، فلمی رسالے چاٹنے کا شوق، اشاریوں کے ڈراموں میں گوڈے گوڈے غرق ہونے کا چسکہ۔۔۔ یہ سب مشاغل ایک طرف، گھرداری کے معاملے میں وہ واقعی بڑی تیز دست تھی۔ سارے کام منٹوں میں نمٹا کے رکھ دیتی، اسی لیے عنایت بی بی کو اس سے کم ہی شکایتیں رہا کرتیں۔

اللہ اللہ کر کے شادی کے دن آئے۔

ہندی والے دن الگ ہی تماشا رہا۔ مووی والا چھو کر اجو گلی کے ٹکڑے ہی رہتا تھا، وہ خوب اکبری کے ہتھے چڑھا۔ مایوں کے جوڑے میں ملبوس گیندے اور موتیا کے گجرے ہارٹانے، ہندی سے بھرے ہاتھوں کے ساتھ وہ اسے مسلسل کسی ماہر ہدایت کار کی طرح ہدایات سے نواز رہی تھی۔ بے بے کی گھوریاں بھی اس پہ ذرا اثر نہ کر رہی تھیں۔

”گانے ذرا پھڑکتے ہوئے بھرتا، وہ سڑے بے سن چوتھروالے نہ بھروینا۔ جب ہم دونوں دلہن بن کے ہال میں آئیں تب پیچھے وہ والا گانا بھرتا۔ ”کلیوں کا چمن جب کھلتا ہے“ اور بارات کے آنے پہ ”جادوگری سے آیا ہے کوئی جادوگر“ لے کے پہلا پہلا پیار بھر کے آنکھوں میں خمار۔ ”وہ والا۔“ وہ لہک کر بولی۔ آس پاس بیٹھی نو عمر لڑکیاں منہ پہ دوپٹے رکھ کے ہنسنے لگیں۔

”اور بات سن، خبردار جو رخصتی کے وقت ”بابل کی دعا“ میں لیتی جا“ لگایا تو۔۔۔ وہ والا بھرتا ”میں چلی میں چلی“ دیکھو پیار کی گلی۔ ”یا پھر۔۔۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”ادھر چلی۔۔۔ میں ادھر چلی۔۔۔ جانے کہاں میں کدھر چلی۔“

ایک ہم مزاج کزن نے اس کی مشکل آسان کی۔

بے چارہ مووی میکر منہ کھولے سب سنتا رہا۔ اگلے دن منہ کھولنے کی باری اس بیوٹیشن کی تھی جسے مشورے دے دے کر اکبری نے اس بے چاری کی مت مار کے رکھ دی۔

”گال تولال کیے نہیں، میرا تو قدرتی حسن ہی اتنا ہے۔ میک اپ کی ضرورت نہیں۔ میرے گالوں سے لہو ایسے لشکتا ہے جیسے کشمیری سیب لیکن تو نے سفیدہ سائل کے ساری لالی ہی چھپا دی۔ اب کم از کم بلش آن ہی پھیر دے۔“

”لگایا تو ہے اور کتنا لگاؤں، آج کل ایسا ہی میک اپ ہوتا ہے جو زیادہ نمایاں نہ ہو اور جسے آپ قدرتی لالی کہہ رہی ہیں، وہ کسی قسم کی اسکن الرجی ہے جس سے آپ کے چہرے پہ لال لال دھبے پڑ گئے تھے، ان کو چھپانے کے لیے مجھے فاؤنڈیشن اور کنسیلر کا استعمال ضرورت سے زیادہ کرنا پڑا۔“

”یہ میں نے میچنگ لینسز بھی منگا کے رکھے ہیں اور نقلی پلکیں بھی۔ میک اپ کے بعد یہ ضرور لگانا۔“

”یہ پلکیں بہت ہلکی کوالٹی کی ہیں اور یہ کیا۔۔۔ میرون کلر کے آئی لینسز۔۔۔ معاف کیجئے گا اسے لگا کے آپ دلہن نہیں، کسی ہارر مووی کی بھٹکتی ہوئی بدروح لگیں گی۔“

”تمہیں کیا، تم پیسے لو اور اپنا کام کرو۔ کیا تمہیں فیشن کا مجھ سے زیادہ پتہ ہے؟“

”اچھا تو پھر یہ تو بتائیے، کیا آج کل اسی کلو کی دلہنوں کا فیشن چل رہا ہے؟“ وہ بھی شاید ضرورت سے زیادہ صاف گو تھی۔

”ہاں۔“ اکبری نے شرمندہ ہوئے بغیر ڈھٹائی سے کہا۔

”پچاس کلو سے کم کی دلہنیں آج کل نہیں چلتیں۔ تبھی تو تم اب تک کنواری بیٹھی ہو۔“

اس طعنے پہ چل کے سچ مچ کی چالیس کلو کی چالیس سالہ کنواری بیوٹیشن نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کے ڈارک میرون بلش آن اس کے غبارہ نما رخساروں پہ تھوپ دیا۔ پلکیں بھی جان بوجھ کے بس ٹانگنے کے



سے انداز میں اس طرح چپکائیں کہ اب گریں کہ تب گریں۔

اصغری نے ہمیشہ اکبری کی ضد میں آکے وہ کیا جو اس کے بالکل الٹ ہوتا تھا۔ اس کے میک اپ کی باری آئی تو تک چڑھی اصغری کی خوش اخلاقیوں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کا اخلاق اس وقت عروج پہ تھا۔

”اللہ باجی! آپ کے ہاتھ کتنے نرم ہیں۔“ مساج کرواتے ہوئے اس نے مسکے پالش اشارت کی اور میک اپ ختم ہوتے ہوتے وہ اس سے ہنسنا گانٹھ چکی تھی۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اس کا میک اپ اکبری کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھا ہوا۔

”ہائے بے بے رولی کب کھلے گی؟“ نکاح ہو چکا تھا اب دو لہا لہن کو اسٹیج پہ اکٹھے بیٹھا کے مووی بنوائی جا رہی تھی جب بے بے کے ساتھ بیٹھی اکبری نے منمننا کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”دیکھیں غالباً“ کھل چکی تھیں۔ ”قورمہ“ بریانی کی خوشبو میں اسے پاگل کر رہی تھیں۔

”آرام نال بیٹھ۔“ بے بے نے کہنی کا کاری وار اس کی ان پسلیوں پہ کیا جو چربی کی تسوں تلے مدفون تھیں۔

”کھانا لگ گیا“ آجاؤ بی بیو بھائیو۔“ بڑے تاؤ جی نے درباری قسم کا با آواز بلند اعلان کیا۔ سب سے پہلے اکبری بھاری لہنگا سنبھالتی صوفے سے اٹھی۔ حاتم حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ بے بے نے ہاتھ پکڑ کے اسے نیچے صوفے پہ بٹھا۔ ”تم چاروں کے لیے کھانا ادھر میز پہ لگ جائے گا۔“

”اوئے بیرے۔“ اکبری نے ویٹر کو آواز دے کے بلایا۔

”پالک گوشت اتنا کم کیوں لایا ہے اور بریانی میں کوئی ٹکام کی بوٹی ہی نہیں۔ ساری گردنیں ہی گردنیں۔ یہ ڈش لے جاؤ مرغی کی دو چار ٹانگیں ڈال کے لاؤ اور ہاں فیرونی کا ڈونگا ابھی لا کے رکھ دو بعد

میں ختم ہو جاتا ہے یا پھر نری فیرونی۔“ ”نری فیرونی؟“ لقمان نے نئی نویلی بھابی کے بے تکلفانہ آرڈرز پہ اچھی طرح حیران ہونے کے بعد سوال کیا جبکہ حاتم پوری آنکھیں کھولے قورمے سے نبرد آزما اپنی دلہن کو دیکھ رہا تھا۔ ”ہاں تو نری ہی ہوئی“ اوپر کی ملائی پستہ بادام کی ہوائیاں اور چاندی کا ورق تو سارے بارانی کھا جاتے ہیں۔“

حاتم نے سرد آہ بھر کے چھوٹے بھائی کی سنجیدہ سی نظر آتی دلہن کو چاول کی پلیٹ میں چمچ گھماتے ہوئے دیکھا جو دیر حقیقت ”اچھی طرح“ شرمندہ ہونے میں مصروف تھی۔



”تمہیں منہ دکھائی میں کیا ملا؟ خیر۔۔۔ جیسا منہ ہوگا“ ویسا ہی تحفہ ملا ہوگا۔“ اکبری نے ویسے کی صبح بڑی رازداری سے اصغری سے پوچھا۔

”یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کہی۔ واقعی بڑا پیارا سا تحفہ ملا ہے۔“ اس نے گلے میں پڑے سونے کے لاکٹ پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اترا کے کہا۔ اس پہ اب تک اکبری کی نظر نہ پڑی تھی اس نے اپنی آنکھیں مقدور بھر باہر نکالتے ہوئے رشک سے لاکٹ کو دیکھا جس میں سونے کا دل کی شکل کا فریم سا تھا جس میں لقمان کی ہونق صورت نظر آرہی تھی۔ رشک کو حسد میں بدلتے دیر نہ لگی۔

”تمہیں کیا دیا حاتم بھائی نے؟“

”صد مسم۔۔۔ وہ بھی ناگہانی۔“ وہ ٹسوے بہانے لگی۔ ”نی اصغری! بے بے نے بڑا سخت دھوکا دیا۔ لے کے مجھے بڈھے کے پلے باندھ دیا۔ میں بھی کل سوچ رہی تھی یہ کس زمانے کا دلدہا ہے لیاقت علی خان والی ٹوپی سجا کے بیٹھا ہے۔ رات جو اس نے ٹوپی اتاری۔۔۔ ہائے اتنا بڑا سٹنچ، نشکستی ہوئی ٹنڈ۔۔۔ ابھی ٹنڈ کے لشکارے کم نہ ہوئے تھے کہ اس نے پچھلی داڑھیں بھی نکال کے پانی کے گلاس میں رکھ دیں۔ کتنے لگا



چھوٹی عمر میں ہی دانت گر گئے تھے۔ ہائے۔ ہائے۔  
میری مکی جی جان۔۔۔ تے دکھ لکھتے کروٹ۔۔۔  
”صبر کر میری بہن! ویسے بھی مرد کی عمر کون دیکھتا  
ہے، جیب دیکھی جاتی ہے کہ کتنا کماتا ہے۔“  
”یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ کتنا خرچ کرتا ہے، ہو نہ  
نام کا حاتم۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔

”جیب تو دیکھی بے بے نے مگر یہ نہ دیکھا کہ جوالتی  
کا ہاتھ جیب تک جاتا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے پہلی رات  
میں ہی اندازہ ہو گیا ہے، وہ ایک نمبر کا کجوس انسان  
ہے۔“  
”عقل کروڑی! مجازی خدا کے بارے میں ایسے  
نہیں کہتے۔“

”مکی! تو یقین کر اس کی ٹنڈیا بتیسی نے میرا دل اتنا  
نہیں کلسایا جتنا پلاسٹک کے کپھوں کی اس جوڑی نے  
ترپایا ہے۔“ اس نے مٹھی کھول کے وہ آتشی گلابی  
کلب دکھائے۔

”یہ کا کیوں کے لگانے والے کلب، شوخے رنگ  
کی دس روپے والی جوڑی۔ کیا مجھے منہ دکھائی میں دینے  
کے لیے یہی تحفہ رہ گیا تھا۔“ وہ اصغری کے گلے لگ  
کے چمکوں پہنکوں رونے لگی۔

”صبر کر میری بہن اور خود پہ قابو رکھ۔ شادی والا گھر  
ہے۔ شکر ہے چوبیس گھنٹے سر پہ سوار رہنے کے لیے  
ساس اور مندریں نہیں لیکن ان دونوں کی رشتے کی  
ماسیاں، چاچیاں ابھی گھر پہ موجود ہیں۔ کسی نے تجھے  
یوں دیو داس کی ہیروئن کی طرح ہچکیاں لے لے کے  
روتے دیکھ لیا تو کسی پرانے یار نے یا عاشقی معشوق کا  
جھوٹا الزام لگ جائے گا۔ کیا فائدہ کیا کرایا کچھ ہے  
نہیں، ساری جوالتی عاشقی کرنے کے بہانے ڈھونڈنے  
میں گزار دی اور بدنامی مفت میں۔۔۔ چل چپ کر جا۔“

یہ اس کی مصلحت تھی یا صبر کا وہ درس جو اس نے  
شاید اشار پس کے کسی ڈرامے کی مافوق الفطرت بہو  
سے جو جو تیاں کھا کے بھی اف تک نہیں کرتی، ورنہ  
دل اس کا بھی کم نہ دکھاتا تھا۔ جب لقمان کی حماقتیں اور  
بدحواسیاں ایک ہی رات میں کھل کے اس کے سامنے

آئیں۔ بلکا سا تلانے والا لقمان کسی طور پہ بھی سیانی بی بی  
اصغری کو اپنے لائق نہ لگا مگر وہ ان لوگوں میں سے  
تھی جو ڈھنڈورا پیٹ کر ہمدردیاں بٹورنے کے بجائے  
اپنے ساتھ ہوئے غلط کام کو بھی ہوشیاری سے درست  
کرنے میں وقت نہیں لگاتے۔ اس نے بھی صبر شکر  
کے ساتھ لقمان کو بہر حال قبول کیا اور دل کو بہلانے  
کے لیے اس کی شخصیت میں ایسے پہلو تلاش کیے جن  
کے بارے میں خود لقمان کو بھی کبھی بھنک نہ پڑی تھی۔  
”چل کوئی بات سنیں، دو دانت باہر ہیں مگر ہیں تو  
اپنے۔ عقل کے معاملے میں ذرا ہاتھ تنگ ہے تو تھیک  
ہی ہے، زیادہ سیانا بندہ تو حلق کا کاشا بن کے رہ جاتا ہے،  
حاتم پائی جان کی طرح۔۔۔ اور پھر عقل و شکل میں ہی  
غریب ہے، دودھ دہی کی دکان تو خوب چلتی ہے، روز  
جیب بھر کے نوٹ لاتا ہے اور تھوک لگا لگا کے گنتے  
کے بعد الماری میں رکھ کے تالا نہیں لگا دیتا، حاتم پائی  
جان کی طرح۔۔۔ بلکہ سارے کے سارے میرے ہاتھ  
میں پکڑانے کی قسم کھا چکا ہے۔“

اس نے ایسی ایسی تعریفیں کر کے لقمان کو چنے کے  
جھاڑ پہ چڑھا دیا۔ چھوٹی عمر میں یتیم ہونے کی وجہ سے  
وہ سالوں سے خود سے بارہ سال بڑے بھائی حاتم سے  
اپنی کم عقلی اور ڈھیلے پن کی صلواتیں ہی سنتا آ رہا تھا۔  
اس میں اعتماد نام کی کوئی چیز حاتم نے باقی نہ رہنے دی  
تھی، ایسے ہی طعنے دے دے کر۔ اب جو دن رات  
پروانے کی طرح آگے پیچھے ”میں قربان“ میں صدقے“  
کہتی بیوی ملی تو اس کی چھاتی تن کے اور جوڑی ہو گئی۔  
اصغری کا بس نہ چلتا تھا، اس کے منہ میں نوالے تک  
خود بنا کے ڈالے، اور سے اس کا طرز تخاطب۔۔۔

”ہنی۔۔۔ اٹھئے نا، صبح ہو گئی۔“  
”سوہنے! اور پر اٹھا لو نا، دیکھو کتنے کمزور لگ رہے  
ہو۔“

”ڈار لنگ، آج شام کو کہیں باہر چلیں؟“ وہ اس  
کے گریبان کے بٹن سے کھیلے ہوئے کچھ اس ادا سے  
پلکیں پٹ پٹا کے کہتی کہ لقمان فدا ہی ہو جاتا اور خود کو  
سچ مچ کا ”سوہنا“ اور ”ہنی“ سمجھ بیٹھتا۔



والے غبارے لاتے ہوئے ساری ہوائنکلی جاتی ہے۔

میری خاطر چار پیسے خرچ کرتے ہوئے۔۔۔

”بات پیسے کی نہیں، اس کے استعمال کی ہے۔

خواجہ خواہ میں لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں حلق تک

ٹھنسانے سے کیا حاصل۔ کیا دے گئی تھیں اصغری

کی سہیلیاں اسے۔ ایک تیس روپے والی گانوں کی

کیسٹ دے گئی تو دوسری ایک ڈائجسٹ جو وہ پہلے ہی

لے چکی تھی۔ تیسری نے تو حد کر دی، چھ عدد کیلے

لفافے میں ڈال کے لے آئی۔ وہ بھی اتوار بازار والے

ستے۔ اور تو اور تمہاری بے بے نے بھی دل کھول کے

تحفہ نہ دیا۔ کیسا ستا سا ڈیکوریشن پیس پیک کر کے

دے دیا۔ اتنا خرچا کرنے کے بعد لقمان کے پاس بھی

اتنا پیسہ نہ بچا کہ وہ بیوی کو ڈھنگ کا تحفہ ہی دے پاتا،

اس لیے میری مانو تو فائدے میں رہو گی۔ یوں شوبازی

میں پیسے ضائع کرنے کے بجائے ہم دونوں آپس میں یہ

دن منالیں گے۔ تم اچھا سا سوٹ پہننا، شام کو ہم

شالیمار باغ یا ریس کورس میں گھومنے جائیں گے،

واپسی میں کسی اچھے ہوٹل سے کھانا، مارکیٹ سے

تمہیں پیارا سا تحفہ خرید کے دیتے ہوئے گھر واپسی۔

کیوں، کیسا شاندار اور یادگار پروگرام ہے؟۔

اس کی لچھے دار گفتگو یہ اکبری سوچ میں پڑ گئی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کسی کو کیا پتہ چلے گا، کیا فائدہ

پیسے خرچ کرنے کا جب چار لوگوں کو پتہ ہی ناں چلے۔

سب تو یہی کہیں گے کہ۔۔۔“

”تو تم اپنے تحفے دکھا دینا، ہوٹل میں کھانے اور

گھومنے پھرنے کی تفصیلات بے شک دو ہفتے تک ہر

آئے گئے کے سامنے دہراتی رہنا۔“

یوں حاتم نے اکبری کو اپنی چکنی چٹری باتوں سے

شیشے میں اتار لیا اور جب وہ اپنے سر تاج کا پروگرام بڑھا

چڑھا کے اصغری کو سنار ہی تھی تب اس کے چہرے پہ

چھیلی طنزیہ مسکراہٹ تک نہ دیکھ سکی۔

اگلے دن صبح سے اکبری کی تیاریاں عروج پہ

تھیں۔ پیڑھی پہ چڑھ کے وہ دیوار کے اس پار پڑوسیوں

تک کو اطلاع دے چکی تھی کہ آج شام کو اس کے

”کل میری سالگرہ ہے۔“

اکبری نے اطلاع دی۔ شادی کو تین مہینے گزر چکے

تھے۔

”اچھا۔۔۔ خیر سے کتنے سال کی ہو گئی ہو؟۔“ حاتم

نے آٹے کا تیل بڑی آس کے ساتھ اپنے گنبجے سر پہ

ملتے ہوئے پوچھا۔ اس کی یہ آس بڑی مستقل مزاجی

سے زندہ تھی۔

”جتنے کی بھی ہوئی ہوں، آپ سے پندرہ اٹھارہ سال

چھوٹی ہی ہوں۔“ اس نے حسب عادت عمر میں

زبردست گھپلا مارا۔ پچھلے ہی مہینے اصغری نے بڑی

دھوم دھام سے اپنی سالگرہ منائی تھی۔ لقمان نے دکان

بند کر کے سارا صحن اور برآمدہ رنگ برنگی جھنڈیوں اور

غباروں سے سجایا تھا۔ اصغری نے بے بے اور ابا

کے ساتھ ساتھ اپنی آدھ درجن سہیلیوں کو بھی چائے

پہ بلایا تھا۔ ایک کے علاوہ سوسے، چاٹ، گلاب جامن

اور شامی کباب بھی بازار سے آئے تھے، ساتھ میں پورا

کریٹ ٹھنڈی بوتلوں کا۔ اکبری نے ایک کٹنے پہ نالی

کچھ اس زور سے پٹی تھی جیسے دونوں ہتھیلیوں کے

درمیان کی کاچرہ لے رکھا ہو۔ تب سے جل بھن کے

کلیجہ سیاہ ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ، میں بھی اپنی سالگرہ ایسے ہی

منائوں گی جیسے اصغری نے منائی تھی۔“ اس نے ٹھنک

کے پیر پختے ہوئے فرمائش کی۔

”اصغری کی سالگرہ۔۔۔ وہ ٹھٹھا لگا کے ہنسا۔

”یعنی غباروں، جھنڈیوں والی سالگرہ۔۔۔ اس پینڈو

لقمان سے اور امید بھی کیا رکھی جاسکتی ہے مگر مجھ سے

یہ توقع نہ رکھنا اکبری بیگم! آخر میں ایک سنجیدہ اور

باوقار آدمی ہوں۔“

اکبری کو اس کے سنجیدہ اور باوقار ہونے پہ تو کیا

”آدمی“ تک ہونے پہ بھی یقین نہ تھا، اس لیے کمر پہ

ہاتھ رکھ کے شروع ہو گئی۔

”یوں کہو، میرے لیے دس روپے درجن ملے



اعزاز میں ”حاتم جی“ کیا سخاوت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ ساری دوپہر وہ مختلف الابلا تھوپ کے چہرے پہ نکھار لانے کی سر توڑ کوششیں کرتی رہی۔  
”بائیس روپے کلو آلو ہیں وڈی جو تو ان دیدوں پہ کاٹ کے سجائے ہوئے ہے۔“

اصغری نے اس کی آنکھوں پہ رکھے آلو کے قتلے جھپٹ کے اٹھائے۔

”ججھے کیا تکلیف ہے۔ باورچی خانے کا سودا اکیلے تیرے بندے کی کمائی سے تو نہیں آتا۔ ایک ذرا سا آلو میرے استعمال میں آگیا تو ججھے کیا مروڑ اٹھ رہے ہیں۔“

”ذرا سا آلو۔؟ ان بالوں میں ایک انڈہ پاؤ بھرو ہی دو لیموں غرق ہو چکے ہیں۔ اس تھوڑے پہ تو باری باری کیلے، ٹماٹر اور کھیرے پچل کے مل چکی ہے۔ اب شہد میں بادام کا تیل ملا کے تھوپا ہوا ہے۔ اتنا خرچا کس کے کھاتے میں جائے گا، میرے بندے کے ہی نا۔ تیرا بندہ تو آنہ آنہ گن کے خرچا ڈالتا ہے۔ وہ بھی بڑا احسان جتا کے۔“

”تمیز سے بات کر نکلی! تو صرف میری نکلی ہی نہیں، حاتم جی کی بھی نکلی ہی ہے۔ ان کے نکلے بلکہ بہت نکلے بھائی کی بیوی۔ ادب سے بات کر۔“

”ارے بھائی ہو گا وہ لقمان کی نظر میں، میرے لیے تو۔“ ابھی وہ ہاتھ نچا کے اپنے دلی جذبات آشکار کرنا ہی چاہتی تھی کہ دیوڑھی سے اپنے جیٹھ کی جھلک دیکھ کے الفاظ اور لہجہ کمال درجے کی پھرتی کے ساتھ تبدیل کیا۔

”باپ کے برابر ہے۔“ وہ لہجے میں ادب و احترام سمو کے کہہ رہی تھی۔

”میں نے اس میں جیٹھ اور بہنوئی کے ساتھ ساتھ اتبے کو بھی دیکھا ہے۔ اتنی عزت کرتی ہوں لیکن وڈی! تو نے لقمان جی کو بہنوئی والا مان تو کیا دینا تھا، کبھی دیور والی محبت تک نہ دی۔ بڑی بھر جائیاں تو چھوٹے دیور کے کیسے کیسے لاڈ اٹھاتی ہیں۔“

”نفع۔“ اس نے نفرت سے ہاتھ ہلایا۔ اس کی

صرف آنکھیں ہی چھوٹی نہ تھیں، نظر بھی کمزور تھی اور کان بھی عموماً ”بند ہی رہا کرتے“ اسی لیے نہ تو دیوڑھی میں دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے شوہر نامدار کو دیکھ سکتی نہ ہی اس کی پھپھی کی آواز سن سکتی تھی۔

”ہناؤ۔ اتنا کا کا نہیں ہے وہ۔ رشتے میں چھوٹا ہے تو کیا ہوا، عمر میں تو دس بارہ سال بڑا ہو گا۔ اب اس بڑھے کا کے کو گودی کھلاتی پھروں۔“

وہ شاید کچھ اور بھی کہہ ڈالتی کہ اتنے میں حاتم دھپ دھپ کرتا اس کے پاس سے گزرا اور کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کرنے کے بعد پیپسٹروں کا پورا زور لگا کے چلایا۔

”اکبری۔۔۔“

”جی آئی۔“ وہ دوپٹے سے چہرے پہ لپا ملغوبہ صاف کرتی اندر کی جانب لپکی۔ اصغری نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بند دروازے کو دیکھا۔

”ہو نہ، بڑی آئی سالگرہ منانے والی۔ ابھی تیرا ختم دلاتا ہے تیرا حاتم طائی۔“

تھوڑی بہت گرما گرمی ضرور ہوئی مگر نتیجہ بہر حال اصغری کی توقع کے خلاف تھا۔ شام ہوتے ہی حاتم حسب وعدہ بنی سنوری اکبری کو لیے گھمانے کی نیت سے گھر سے نکلنے کو تیار تھا۔ اکبری نے اورنج کلر کی ساڑھی لپیٹ رکھی تھی جس کے بارڈر پہ گولڈن اور براؤن کلر کا بھاری کام تھا۔ براؤن اور گولڈن چیک کا بنارس پھنسا ہوا بلاؤز تھا جس کی آدھی آستینوں کے کناروں پہ اورنج نگ ٹنگے ہوئے تھے۔ سارا دن کی رگڑائی کے بعد سفید رنگت پہ سرخ سرخ دھبے نمایاں تھے۔ ہونٹوں پہ براؤن آؤٹ لائن کے ساتھ اورنج چمک دار لب اسٹک جی بھر کے تھوپی گئی تھی۔ اورنج کلر کے آئی لینس۔۔۔ ہائی ہیل کی گولڈن سینڈل، سونے کا بھاری سیٹ، ایک ہاتھ میں سونے کی تو دو سرے میں کانچ کی میچنگ چوڑیاں مشقت کے ساتھ چڑھائی گئی تھیں۔ فل تیاری کے ساتھ پھپھی پہ ٹھسے سے بیٹھے ہوئے اس نے ترچھی نظروں سے جھاڑ دیتی اصغری کو دیکھا جو لا پروا نظر آنے کی بھرپور کوشش



کر رہی تھی۔

”ہوٹل کا کہہ کے ڈھابے پہ لے گئے، لکڑی کے  
بیچ پر بیٹھ کے چھو لے اور چمڑے جیسے نان کھائے۔  
آس پاس بیٹھے سارے رکشے والے اور قلعی کرنے  
والے مزدوریوں تماشا دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی  
شوٹنگ ہو رہی ہو۔ تانبے کے ٹیڑھے میڑھے گلاس  
میں گنداپانی میں نے پینے سے انکار کیا تو بڑا منہ بنا  
ہوئے ڈھائی روپے والی ”ٹھاہ بوتل“ لکڑی ہضم پتھر ہضم  
پلائی وہ بھی سو احسان جتا کہ بغیر بوتل کے تیرے  
حلق سے روٹی نہیں اترتی۔ اور تو اور ریس کورس  
پارک کی سیر کرانے کے بجائے اتنی رات کو لارنس  
گارڈن لے گئے۔“

”ہاں، وہاں ٹکٹ جو کوئی نہیں۔“ اصغری نے سر ہلا کے کہا۔

”ہاں۔۔۔ نہ ٹکٹ۔۔۔ نہ کوئی لائٹ۔۔۔ گھپ اندھیرا۔۔۔ چھری چھراورکتے ہی کتے۔۔۔“

”اور وہ تحفے جن کا وعدہ کیا گیا تھا؟“ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”یہ وعدہ بھی پورا کیا مگر انے اسٹائل میں۔ گن کے پانچ تحفے دیے۔“ اس نے تفصیل گنوانے سے پہلے مزید چند آنسو ٹپکائے۔

”ایک تو یہ گلاب کا پھول جسے لارنس گارڈن سے  
توڑنے سے پہلے چھ کے چھ گلے انہوں نے پڑھے ماکہ  
مغرب کے بعد پھول توڑنے پہ کوئی ڈائن پیچھے نہ پڑ  
جائے۔————— سرا یہ تمباکو والا  
پان‘ اس میں بھی آدھا خود کھاگئے، اسی لیے تو بیٹھا  
نہیں لے کے دیا، خود کو جو نہیں پسند۔ یہ باقی والا بھی  
منہ پہ ماروں گی۔ تیسرا تحفہ وہ نان چنے والا کھانا، چوتھا  
تحفہ وہ گھٹیا بول۔“

”ہائے اللہ۔“ وہ غصے سے بھڑاس نکالتی اچانک شرم سے بیر بہوئی ہوتی منہ پہ دوپٹہ رکھ کے دوہری ہو گئی۔

”اب ساری باتیں تو بتانے والی نہیں ہوتیں نا۔“  
”صدقے جاؤں تیری شرم کے۔“ اصفری کو سخت

”اس جھاڑو کو چھوڑ نکی! باورچی خانے کی خبر لے۔  
 لگتا ہے دال لگ گئی، باہر تک بدبو آرہی ہے۔ جلدی  
 سے چولہا بند کر، ورنہ رات کو جلی ہوئی دال کھانا پڑے  
 گی، تیرے جلے ہوئے کلیجے کی طرح۔“ آخری الفاظ  
 اس نے زرب لب بدبڑاتے ہوئے ادا کیے۔

لیکن واپسی پہ اس کا اپنا کاجبہ دھواں دے رہا تھا۔ وہ تن فن کرتی پھینٹی سے اتری۔ جوڑے پہ ٹنگا کپڑے کا نارنجی بڑا سا پھول نوج کے اتارا۔ وہیں برآمدے میں پھینک کے برابر والے صوفے پہ ڈھیر ہو گئی۔ حاتم نجانے کس طرح خطرے کی بوپائے ڈیوڑھی سے ہی فرار ہو چکا تھا۔ اپنی شاہی سواری پارک کرنے کے بعد۔

اصغری نے اسے سینڈ لیس اتار کے پرے پھینکنے کے بعد سوئے ہوئے پیر سہلاتے ہوئے دیکھا تو دل میں پھوٹے لذوؤں کو چھپائے چہرے پہ فکر مندی اور ترزد سجا کے اس کے یاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا دہی! کیا آج رستے میں پھر پائی جان کی موٹر سائیکل خراب ہو گئی۔ کہیں کچے اس ساڑھی میں دھکا تو نہیں لگنا پڑا؟“

”دھکا اشارت تو میری زندگی ہو گئی ہے نک! میرا حسن و جوانی اس ناقدِ رے کی جھولی میں بن مانگے گرا مگر اس نے رول کے رکھ دیا۔ کوئی اور ہوتا تو میرے پیر دھو دھو کے یتا۔“

اصغری نے ناک چڑھا کے اس کے سوچے ہوئے  
پیر دکھے۔

”ایک بات کہوں، پیر تو تجھے خود بھی دھوٹا چاہئیں، جتنی محنت منہ پہ کرتی ہے، اتنی کبھی کبھار... چلو زیادہ نہیں، مہینے، ڈیڑھ مہینے بعد ہی ان پیروں پہ بھی کر لیا کر۔ دیکھ کے جی مبتلا تا ہے اور تو چاہتی ہے پائی جان ان کی بنانا کے پیس۔ کیا ان کو ہیضہ کرانا ہے۔“ اس نے ابکائی روکی۔

”ہیضہ تو اب مجھے ہو کے رہے گا۔ ایسا شاندار کھانا کھلایا ہے۔“ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔



آئینے میں نظر آتے اصغری کے عکس کو گھور رہا تھا جو اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے جذب کے عالم میں گنگنا رہی تھی۔

میںوں تیرے جیسا سوہنا ہور لبداناں  
”صحیح کہہ رہی ہو کی! ایسا پیس قسمت سے ایک ہی  
بچا تھا اور ظاہر ہے وہ تیرے حصے میں ہی آتا تھا لیکن تیرا  
دل رجبہ نہ رجبہ (بھرے) اب اس کے گوڈے سے  
اٹھ اور باورچی خانے کی خبر لے۔ نونج گئے ہیں اور  
ناشتے کی کچھ خبر ہی نہیں۔ پیٹ میں بھوک کے مارے  
بل اٹھ رہے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا  
ہے۔ آج تو بے چارے حاتم جی بھی چائے خود ہی بنا  
کے اس میں سوکھی ڈبل روٹی ڈبو ڈبو کر ناشتہ کر کے گئے  
ہیں۔“

”تو تم بھی یہی ناشتہ کر لو۔ ویسے بھی مشرقی بیویوں کو  
زیب نہیں دیتا کہ شوہر تو روکھی سوکھی کھائے اور خود وہ  
چکنی چیری ہضم کریں۔“

”چکنی چیری مجھے ہضم ہی کہاں ہوتی ہے۔ کچھ بھی  
کھاؤں، گلے منٹ نکل جاتا ہے۔ الٹیوں نے مت  
مار کے رکھ دی ہے لیکن کیا کروں، کھائے بغیر گزارا بھی  
تو نہیں۔ تجھے پتہ تو ہے میری حالت کا۔“ اس نے سر پہ  
ہاتھ رکھ کے چکرانے کی بھرپور ادکاری کی۔  
”اصغری، سنبھال بھابھی کو۔“ لقمان بے چارہ گھبرا  
گیا۔

”ہنٹی کٹی ہے، پہلے ہی کوئی کام نہیں کرتی، اوپر سے  
اب نیا بہانہ مل گیا ہے پلنگ پہ چڑھ کے بیٹھنے کا۔ میں  
نے ٹھیکا نہیں لے رکھا سارے ٹبر کے ناشتے روٹی کا۔  
میں اکیلی جان کیا کیا کروں۔ یہ تو بس اپنے کمرے میں  
جھاڑو لگا کے بیٹھ جاتی ہے، سارے گھر کی صفائی،  
دھلائی، کپڑوں کی دھلائی، پانڈی روٹی، میں کیا کیا  
سنبھالوں۔ کیا یہ میری اکیلی کا گھر ہے۔ کہنے کو یہ بڑی  
بنتی ہے گھر کی مگر ذمہ داری کوئی لینے پہ تیار نہیں۔“  
”مجھے پتا تو ہے میری طبیعت آج کل ٹھیک نہیں  
رہتی، ورنہ اپنا اور اپنے بندے کا ناشتہ میں خود ہی بناتی  
تھی۔ ایک ٹائم کے برتن بھی دھو لیتی تھی اور آٹا بھی

تاؤ آیا۔ اس کا تو خیال تھا، سارے پروگرام کا بیڑا غرق  
ہوتے دیکھ کے اکبری گھر سر پہ اٹھالے گی۔ آج رات  
مفت کا شو دیکھنے کو ملے گا لیکن اس ”پانچویں کھنے“ پہ  
اس کا شرم سے لال گلابی ہونا بتا رہا تھا، ہمیشہ کی طرح اس  
بار بھی غصہ حاتم کے گھر آنے سے پہلے پہلے اتر چکا  
ہوگا۔

”بڑی جلدی واپسی ہو گئی بھابھی! یہ کوئی اچھی بات  
تو نہیں، اکیلے اکیلے خوشیاں منانا۔“ لقمان بھی کمرے  
سے برآمد ہوا۔

”چلو خیر، یہ تو بتائیں کیا کیا عیش کیے، کیا کچھ کھایا  
پیا؟“

”حاتم طائی کی قبر پہ لات مار۔۔۔“ ابھی وہ نئے  
سرے سے جلے دل کے پھپھو لے پھوڑنے جا ہی رہی  
تھی کہ لقمان پوری بات سننے سے قبل ہی بدک اٹھا۔  
”یہ کیا کہہ رہی ہو بھابھی! بھائی جان کو تائی جی کی قبر  
پہ لات مارنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ خدا کا خوف کرو۔  
ٹھیک ہے تائی جی نے زندگی بھر ہمارا تو کیا دنیا میں کسی کا  
بھلا نہ کیا ہوگا لیکن بہر حال بزرگ، بزرگ ہوتے  
ہیں۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا کہ ہم اپنے بیٹوں کی  
قبروں پہ ٹھڈے اور لاتیں مارتے پھریں۔“  
”ہائے ہائے لقمان جی! وڈی کا مطلب یہ نہیں  
تھا۔“

”جو بھی ہو، شکر کرو بھائی جان گھر پہ نہیں، ورنہ وہ  
بڑا برا مانتے۔ ان کے دل میں بزرگوں کے لیے بڑا درد  
ہے۔“

”بس نرا درد ہی درد تو ہے۔ اپنے دل میں نہیں  
سماتا، اس لیے ادھر ادھر بھی سوغات کی طرح بانٹتے  
پھرتے ہیں۔“ اکبری جل کے رہ گئی۔



میںوں تیرے جیسا سوہنا ہور لبداناں  
بیٹھی رہو اس تیرے کول لول رجداناں  
لقمان بڑے اشاکل سے برآمدے کی دیوار پہ  
نصب آئینے میں بال بنا رہا تھا اور مستانی نظروں سے



گوندھ دیا کرتی تھی۔ باقی کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کا کام تو ہمیشہ سے تو کرتی آئی ہے۔ مجھے کب آتی ہے ہانڈی رولی۔“

”تو کیا یہ میرے نصیبوں میں لکھ دیا گیا ہے کہ ابے کے گھر بھی میں ہی چاکری کروں۔ یہاں بھی میں ہی رگڑی جاؤں۔ یہ اچھا بہانہ ہے کہ مجھے کچھ آتا جاتا ہی نہیں۔ نہیں آتا تو سیکھ لے اب اور کس عمر میں سیکھنا ہے۔ میری طرف سے صاف جواب ہے، آج کے بعد میں کسی کے کام کاج کی ذمہ دار نہیں۔ میری بلا سے کوئی بھوکا مرے میں تو بس اپنا اور اپنے بندے کا کام کروں گی۔“

کام کے معاملے میں پچھلے آٹھ ماہ کے دوران دونوں کی کئی ہلکی پھلکی جھڑپیں ہو چکی تھیں، مگر ہر تلخ کلامی کے بعد بھی اصغری سارے گھر کا انتظام سابقہ خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے صاف اعلان کیا اور اس پر قائم بھی رہی۔

گھر میں جیسے دھول مٹی اڑنے لگی، اصغری اپنے کمرے کی صفائی کرتی، اپنے اور اپنے میاں کے حصے کا کھانا پکاتی، اپنے اور میاں کے ہی کپڑے دھوتی۔ چار پانچ دن تک ایسا ہوتا رہا۔ حاتم باہر سے کھانا لاتا رہا۔ آخر چھٹے روز لقمان سے رہانہ گیا۔

”کیا ہو گیا اصغری! اتنی کٹھور کیوں بن گئی ہے“ بھر جانی تیری سگی بہن ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ وہ دوسرے جی سے ہے۔ مانا کہ تیری باتیں سچی ہیں لیکن یہ وقت ایسا نہیں کہ تو ضد لگا کے بیٹھ جا۔ مشکل وقت میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔“

”بس لقمان جی! مجھے یہ پٹیاں نہ پڑھائیں۔“ وہ منہ سرپیٹ کر کروٹ بدل کے سوتی بن گئی۔ آخر دونوں بھائی سرجوڑ کے بیٹھے۔

”بات ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے لقمان! یہ دونوں سیدھے منہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی روادار نہیں۔“

”میں نے تو سمجھانے کی کوشش کی تھی پر۔۔۔ ویسے تو اصغری میری ہر بات مان لیتی ہے لیکن اس بار ضد پہ

اڑی ہے۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے بے وقوف کہ وہ تمہاری ہر بات مان لیتی ہے جبکہ حقیقت میں وہ بڑی ہوشیاری سے تمہیں اپنی انگلیوں کے اشاروں پہ نچاتی ہے۔ جو کرنا چاہتی ہے، وہ طریقے کے ساتھ تمہارے منہ سے کہلواتی ہے اور پھر تابعدار بن کے تمہارا دل جیت لیتی ہے۔“

”یہ تو بھائی جان۔۔۔ آپ وہ بتا رہے ہیں جو آپ خود بھر جانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ میری اصغری کیا جانے یہ چالاکیاں۔۔۔؟“

”تیری بیوی نے تجھے آلو کا گوشت کھلا رکھا ہے، تب ہی اس کے علاوہ تجھے کچھ سوچتا ہی نہیں۔“ ”سوہنا، سوہنا“ کہہ کے تیرا دماغ عرش پہ چڑھا رکھا ہے۔“

”وہ مجھے سچا پیار کرتی ہے۔“ وہ بدبدا کے رہ گیا۔

”ہو نہ! تو اس سچے پیار کا واسطہ دے کر تو اپنی

تابعدار، فرمانبردار اور سیدھی سادی بھولی بھائی بیوی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ یہ ہٹ دھرمی چھوڑ دے اور گھر کے حالات میں جنگ کا ماحول نہ پیدا کرے۔ ادھر اکبری کا برا حال ہے۔ ایک تو طبیعت کی خرابی، دوسرے بہن کی بے رخی۔ مجھ پہ زور ڈال رہی ہے کہ میں اس کے لیے نوکرائی کا بندوبست کروں۔ اب بتا، سرکاری نوکری میں، میں یہ عیاشیاں کیسے برداشت کروں۔“

”ہاں اس لیے میری بیوی کے روپ میں بن تنخواہ کے کام کرنے والی نوکرائی چاہیے۔“

”اچھا، کچھ عرصے کے لیے تو وہ یہ ضد چھوڑ سکتی ہے نا۔ یہ مشکل وقت نکل جائے تو پھر میں اکبری کو سیدھا کر کے رکھ دوں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے برابر کا کام نہیں کرتی۔ فی الحال تو بیوی کے لیے مجھ سے تو اکھڑے انداز میں بات نہ کر۔ ایسا نہ ہو ان کی لڑائیاں ختم کرانے کی کوشش کرتے کرتے ہم خود جھگڑیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ اللہ اللہ کر کے ایسا موقع آیا ہے ہمارے گھر میں، برسوں بعد خوشی کی خبر آئی ہے اور



ہم۔۔۔  
 ”ایک آئیڈیا آیا ہے میرے دماغ میں لقمان!“ وہ  
 پھڑک اٹھا۔



”آیا تھا آج حاتم میرے پاس اپنی بیوی کی  
 سفارشیں لے کر۔“ لقمان نے پھل کالافافہ اصغری کو  
 تھماتے ہوئے بتایا۔ وہ چونکی کہ پہلی بار اپنے میاں کو  
 بڑے بھائی کا نام لیتے سنا تھا، ورنہ وہ ہمیشہ بڑے ادب  
 سے ”بھائی جان“ کہہ کے پکارا کرتا تھا۔  
 ”نوکرانی میں وارے نہیں کھاتا اور اکبری سے کام  
 کاج نہیں ہوتا۔ اس کا بلڈ پریشر بہت ہائی رہنے لگا  
 ہے۔ ڈاکٹر نے صاف کہا ہے کہ گرمی میں کام کرنے  
 سے بلڈ پریشر اور ہائی ہو گا جو اس کے لیے خطرناک  
 ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا کہ اتنی  
 فکر ہے تو خود چھٹیاں لے کر گھر بیٹھ جاؤ اور بیوی کی  
 خدمتیں کرو۔ میری اصغری کیا مفت کی نوکرانی ہے۔“  
 ”کیا۔۔۔ آپ نے سچ سچ یہ کہہ دیا؟“ وہ مشکوک سی  
 تھی۔

”تو اور کیا؟ تو سچی ہے اصغری! واقعی ہم کیوں ان  
 سے دب کر رہیں، کیا صرف اس لیے کہ وہ دونوں بڑے  
 ہیں جبکہ صاف ظاہر ہے کہ زیادہ میں کماتا ہوں اور گھر  
 پہ خرچا بھی زیادہ میری جیب سے ہی ہوتا ہے۔“  
 ”اچھا یہ تو بتائیں لقمان جی! کیا واقعی اکبری کو بلڈ  
 پریشر بہت زیادہ رہنے لگا ہے؟“ پچھلے ایک ہفتے سے  
 دونوں میں بات چیت بند تھی۔

”پتا نہیں ہو سکتا ہے۔ کھاتی بھی تو اتنا ہے۔ جتنی  
 چربی چڑھائی ہے اتنی بیماریاں تو لگیں گی۔ خیر اب دیکھنا  
 کیسے دنوں میں ساری چربی پگھلتی ہے۔ تم کام سے ہاتھ  
 روک کے رکھو، میں خرچے سے روکتا ہوں۔ اب  
 صرف اتنا ہی سودا ڈالوں گا جتنا ہم دونوں کے لیے کافی  
 ہو اور وہ بھی یہاں کمرے میں تالے لگا کے رکھنا، ورنہ  
 وہ تمہاری چٹوری بہن سب کھاپی جائے گی۔ لو، تم یہ  
 انگور چکھو، بہت میٹھے ہیں اور خاصے مہنگے ملے ہیں اور

سوات کے سیب۔۔۔ ان کا جوس بہت عمدہ نکلتا ہے۔“  
 اصغری نے بڑے شوق سے انگور کے دانے ٹوٹے  
 مگر نجانے کیوں اسے نگلنے دشوار ہو گئے۔



”اور کوئی بات نہیں، اصل میں یہ سب حسد اور  
 جلن کی وجہ سے ہے۔“ حاتم نے فتویٰ صادر کیا۔  
 ”آپ ٹھیک کہتے ہو جی! یہ نکی تو ہمیشہ میری  
 خوبصورتی اور صحت سے جلتی رہی ہے۔ اپنا رنگ جو  
 دھوئیں جیسا اور وجود سوکھی لکڑی جیسا ہے۔“ اکبری  
 نے تائید میں سر ہلایا۔

”یہ حسد اب اور شکل اختیار کر گیا ہے۔ تم دونوں  
 کی شادی اکٹھے ہوئی، اکٹھے گھر بسے لیکن تم پہلے ماں  
 بن رہی ہو جبکہ ادھر ابھی دور دور تک آثار نظر نہیں  
 آتے، اسی لیے مارے جلن کے الٹی سیدھی حرکتیں  
 کر رہی ہے۔“

”واقعی؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”میرا دل نہیں مانتا۔ چلو اور باتوں میں جلن حسد  
 چلتا رہتا ہے لیکن میری اتنی بڑی خوشی یہ وہ کیسے دل مار  
 کے بیٹھ سکتی ہے۔ اسے تو سن کر بڑی خوشی ہوئی تھی،  
 تب تو۔۔۔“ لیکن حاتم نے اسے بات مکمل نہ کرنے  
 دی۔

”تب دنیا دکھاوے کے لیے خوشی کا اظہار کرنا پڑا تھا  
 لیکن اندر سے اس نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب  
 تمہیں تنگ کر کے رکھنا ہے، اسی لیے تو سوچے سمجھے  
 منصوبے کے تحت یہ سب کیا ہے۔ ادھر تمہاری  
 حالت خراب ہے، ادھر اس نے گھر کے حالات  
 خراب کیے ہیں تاکہ ٹینشن اور پریشانی سے تمہاری  
 صحت پہ برا اثر پڑے۔“

”شاید۔۔۔ چالاکیاں تو واقعی اسے بہت آتی ہیں۔“  
 ”اور لقمان ٹھہرا لو کا۔۔۔ اسے تو اندھا کر کے رکھا  
 ہے تمہاری بہن نے۔ میرا تو دل نہیں چاہتا ان دونوں  
 کی شکل دیکھنے کو۔ تھڑلے، کینے لوگ۔ میرا بھائی  
 پہلے ایسا نہیں تھا مگر بیوی کی محبت میں اس کا خون بھی



سفید ہو گیا ہے۔ خیر اللہ دیکھ رہا ہے۔ دوسروں کی خوشیوں پہ کلمے والے خود بھی کبھی خوش نہیں رہتے۔

اس کھلی بددعا پہ اکبری کا دل کانپ کے رہ گیا اور وہ بے ساختہ ”اللہ نہ کرے“ کہہ اٹھی۔



شادی سے پہلے بھی یہ ان کا معمول تھا۔ روزمرہ کی جھڑپوں کے علاوہ ہر مہینے پندرہ دن بعد ایک زوردار جنگ ہوتی۔ تین چار دن تک زبانی کلامی فائرنگ اور گولہ بارود کی بمباری جاری رہتی۔ اگلے دو تین دن منہ پھلائے گزرتے۔ بالآخر جھگڑے کے چھٹے نہیں تو کم از کم ساتویں دن صلح ہو ہی جایا کرتی مگر وہ ماں باپ کا گھر تھا اور وہ لڑائیاں دو اوپر تلے کی بہنوں کی تھیں۔ غیر شادی شدہ، غیر ذمہ دار اور الھڑ لڑکیوں کی۔ جبکہ یہ گھر ان دو لڑکیوں کا تھا جو شادی شدہ زندگی میں داخل ہونے کے بعد ذمہ دار گھریلو عورتیں بننے کے مرحلے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اب ان جھڑپوں کو بہنوں کی کھٹ مٹھی نوک جھونک کے بجائے دیورانی جھٹالی کے روایتی جھگڑوں کے تناظر میں لیا جاسکتا تھا اور ان کے مابین کشیدگی دونوں بھائیوں کے آپس کے تعلقات پہ بھی اثر انداز ہو سکتی تھی۔

اس خطرے کو سب سے پہلے حاتم نے بھانپا تھا اور اس کے سدباب کے لیے یہ منصوبہ بنایا۔ وہ جانتا تھا کہ اکبری اور اصغری مزاجاً ”مشرق مغرب ہی سہی“ دونوں کے درمیان بے شک ہر معاملے میں بے شمار اختلافات سہی مگر ہیں تو بہنیں۔ فطرتاً ”دونوں گرم مزاج ہیں مگر ایک دوسرے کی دشمن تو نہیں ہو سکتیں۔ اگر دونوں کو زبردستی قریب لانے کے بجائے یہ احساس دلایا جائے کہ ان کے یہ معمولی اختلافات بگڑ کے سنگین صورت حال بھی اختیار کر سکتے ہیں تو شاید اپنی اپنی جگہ دونوں کو اپنے رویوں کا احساس ہو۔ اب اس عمر میں وہ اپنی بیویوں کی بچپن کی عادتیں تو بدلنے سے رہے۔ بس یہی ایک طریقہ تھا گھر کا ماحول پر سکون بنائے رکھنے

کا۔ طبیعت کے لحاظ سے حاتم اور لقمان میں بھی واضح فرق تھا۔ حاتم فطرتاً ”سنجیدہ مزاج“ قدرے روکھا کنجوس اور چالاکی کی حد تک سمجھ دار تھا جبکہ لقمان فطری طور پہ ہنس مکھ، سادہ دل، شاہ خرچ اور حماقت کی حد تک سیدھا تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آسکی۔ حالانکہ ان کے سر سے والدین کا سایہ بھی مدت ہوئے اٹھ چکا تھا۔ حاتم اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتا اور اپنی سختی کی وجہ سے لقمان کی حماقتوں کو کنٹرول میں رکھتا جبکہ لقمان ذرا سی پس و پیش کرنے کے باوجود دل سے بڑے بھائی کی حاکیست اور برتری کو تسلیم کرتا تھا اور اس کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔

دونوں کی پُر امن زندگی منتشر ہو کے رہ گئی۔ جب اکبری اور اصغری کی صورت میں ان کے پرسکون آنگن میں دو محاذ کھل گئے۔ اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ دونوں بہنیں دل کی بُری نہیں اور ہر بڑے جھگڑے کے بعد چند دن کی ناراضی دکھانے کے بعد ان میں پھر سے تعلقات بحال ہو جاتے ہیں لیکن وہ چند دن بھی ان دونوں پہ بھاری گزرتے تھے۔ روز روز کا یہ تماشا خصوصاً حاتم کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا اس لیے اس نے یہ پلان بنایا۔

”اب تمہیں وہی کرنا ہے جو میں کہوں۔“  
”لیکن بھائی جان! میں کیسے آپ کے بارے میں۔۔۔“ وہ یہ گستاخی کرنے کے تصور سے ہی ہراساں تھا۔

”حق! تمہیں کون سادل سے یہ سب کرنا ہے۔ ذرا سی ڈرامے بازی کرے گا تو تیرا ہی بھلا ہو گا۔ زندگی آرام سے گزر جائے گی ورنہ روز کی یہ کل کل۔۔۔ یہ چیخ چیخ۔۔۔ کل کو ہمارے بچے بھی اپنی جاہل ماؤں کی دیکھا دیکھی یہی کچھ سیکھیں گے۔ سارے گھر میں اٹھا بیچ اور تو تو میں میں ہو رہی ہوگی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے بھائی جان! کہ اس کا نتیجہ الٹ نکل آئے۔ وہ دونوں پہلے ہی ایک دوسرے کی



شکلوں سے بیزار ہیں ہمارے اس پلان کی وجہ سے ہو سکتا ہے بالکل ہی کٹ کر رہ جائیں دونوں بہنیں۔“  
”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ حاتم نے پورے وثوق سے کہا۔

”دیورانی جھٹانی الگ ہو سکتی ہیں لیکن دو بہنیں اور وہ بھی ایسی بہنیں جو اس کے علاوہ اور خون کا رشتہ نہ رکھتی ہوں نہ کسی اور بہن کا نہ کسی اور بھائی کا۔۔۔ وہ ایک دوسرے سے کٹ ہی نہیں سکتیں۔ جب ہم انہیں زبردستی ایسا کرنے پہ مجبور کریں گے تو دیکھنا انہیں ”لگ پتا جائے گا۔“ اور دونوں نے پلان کے مطابق ایسا ہی کیا۔ پہلے بہانے بہانے سے ان کے موقف کی تائید کرتے ہوئے انہیں ان کے طرز عمل میں بالکل حق بجانب ٹھہراتے ہوئے ان کی مکمل حمایت کی اور پھر ایسا ظاہر کیا کہ جیسے وہ دونوں بھائی خود بھی اب ایک دوسرے سے نالاں رہنے لگے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اپنی اپنی بیویوں کو سنایا جاتا۔

”یہ چھوٹا اپنی کمائی پہ زیادہ ہی اکڑنے لگا ہے اس کی اوقات کیا ہے۔ آخر ہے تو دودھ وہی والا۔ بس اب میں اس کے ساتھ اور نہیں رہ سکتا۔ کل کو میری اولاد پہ کیا اثر پڑے گا اس اونچ نیچ کا۔ وہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور ہم۔۔۔ ہم یہ نان چھو لے، روٹی چھٹی۔۔۔ میں اپنے بچوں کو احساس کمتری کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔ اب اس گھر کا بؤارہ ہو کے رہے گا۔ عمر بھر اس کی شکل نہ دیکھوں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں حاتم جی! بھائی بھائی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ بالکل ہی الگ ہونے کی بات کریں۔“

”اس کی نوبت تم دونوں بہنوں کی وجہ سے آئی ہے۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے لڑ مر کے پھر ایک ہو جانے کی مگر مردوں میں یہ ذرا اسے اختلافات عمر بھر کی دشمنی میں بدل جایا کرتے ہیں۔ اتنا اکٹھا رہنے کا شوق تھا تو اپنی ذمہ داری کو جاننا تھا، گھر گرہستی والی عورت بن کے رہنا تھا یا پھر تمہاری بہن ہی دل بڑا کر لیتی۔ آج تم دونوں کی وجہ سے ہم بھائیوں کے دل

میں بال آیا ہے۔ اب تم دونوں کو بھی ہماری وجہ سے یہ بھولنا ہو گا کہ تم میں کوئی خون کا رشتہ ہے۔“  
ادھر لقمان، اصغری کو دھمکا رہا تھا۔

”آج بھائی صاحب نے منہ پھاڑ کے کہہ دیا کہ تمہاری بیوی میری بیوی پہ کالا جاؤ گرتی ہے، اسی لیے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے بھی کہہ دیا اصغری کو کیا ضرورت ہے فضول لوگوں پہ فضول وقت ضائع کرنے کی۔ یہ صحت خراب اس لیے ہو رہی ہے کہ اب میری دکان سے سیروں کے حساب سے ان کے لیے دودھ، دہی اور ملائیاں نہیں آتیں۔ میری کمائی کے پھل اور مٹھائی کھانے کو نہیں ملتے۔ اب اپنی تنخواہ کے تین ساڑھے تین ہزار سے بیوی کے چسکے پورے کرو تو جانوں۔ اب ہوش ٹھکانے آئے ہیں جب فاقے کرنے پڑ رہے ہیں۔“

اس کے لہجے میں کمال درجے کی حقارت تھی۔  
اصغری تو لفظ ”فاقے“ پہ ہی سن ہو کے رہ گئی۔ اسے پتہ تھا اکبری بھوک کی کتنی کچی تھی۔

”آپ کم از کم اپنے بھائی کے لیے تو ایسے الفاظ نہ استعمال کریں، انہیں گتہا دکھ ہو گا۔ اگر خدا نخواستہ وہ سن لیں۔“

”سن لیں۔۔۔؟ میں کھری کھری سنا کر آ رہا ہوں۔ مجھے اب کسی کا لحاظ نہیں رہا۔ جو میری بھولی بھالی اصغری پہ الزام لگائے، اسے حسد کا مارا کہے، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں اور مجھے نہیں پتا، اسے دکھ ہوا یا نہیں۔ البتہ غصہ ضرور آیا تھا۔ آپ سے باہر ہو رہا تھا، بؤارے کی دھمکی دے رہا تھا۔“

”تو کیا حالات اتنے بگڑ چکے ہیں؟“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔  
”یہ تو ہونا ہی تھا۔ خون تو ہم دونوں کا خاندانی گرم ہے۔ میرے چاچا اور تایا دونوں میں پینتالیس سال پہلے ایسا ہی جھگڑا ہوا تھا، آج تک ان کی اولادیں اپنے اپنے باپ کی دشمنی نبھا رہی ہیں۔ دس سال پہلے تایا فوت ہوا تو چاچا اگلی گلی میں رہنے کے باوجود نہ منہ دیکھنے آیا، نہ کاںدھا دیئے۔ اپنی بیویوں اور بچوں کو بھی قسم دے دی، اسی قسم کی وجہ سے دو سال پہلے جب



چاچا بھی گزر گیا تو تیا کے گھر سے کوئی افسوس کرنے نہ آیا۔ پینتالیس سال سے دونوں کے گھر والوں نے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی۔ اب اگر حاتم صاحب بوڑھے یہ اتر آئے تو سمجھو یہی تاریخ دہرائی جائے گی۔ ان کے لیے ہم مر گئے اور ہمارے لیے۔۔۔

”اللہ نہ کرے! ایسا نہیں کہتے لقمان جی!“

”بھئی! ہم دونوں بھائی ہیں ذرا الٹے دماغ کے۔ ایک بار جس بات پہ دل کھٹا ہو گیا، سو ہو گیا پھر دل صاف ہونے کی گنجائش نہیں رہتی اور تمہیں کیا اعتراض ہے؟ یہ حالات پیدا بھی تو تمہاری وجہ سے ہوئے ہیں۔“

”لیکن میں یہ تو نہیں چاہتی تھی کہ ہم دشمن بن جائیں۔ ایک دوسرے کی شکل کو ترسیں۔ میرا میکہ ہے ہی کیا؟ بڑھا بابا بڑھی بے بے۔ اور لے دے کے یہ ایک ہی ایک بن۔“ اس کے آنسو نکل آئے۔

”ایک ہی بار رو لو جتنا رونا ہے۔“ اس کے بے رحم لہجے نے آنسوؤں میں روانی پیدا کر دی لیکن لقمان یوں بن گیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔



کسی نہ کسی طرح حاتم نے صرف کپڑوں کی ہفتہ وار دھلائی کے لیے ایک ملازمہ رکھ ہی دی، کیونکہ اکبری کی طبیعت واقعی خراب رہنے لگی تھی۔ البتہ روز روز بازار کا کھانا لانے سے اس نے صاف انکار کر دیا کیونکہ ناقص معیار اور تیز مسالہ جات کی وجہ سے اس کا اپنا معدہ خراب رہنے لگا تھا۔ ناچار اکبری رو دھو کے جیسا تیس سالن بھی بنا لیا کرتی۔ روٹیاں بنانے سے انکار کرنے کی نوبت نہ آئی کیونکہ اس کے ہاتھ کی روٹی ایک ہی بار کھانے کا تجربہ کرنا حاتم کے لیے اتنا ہولناک تھا کہ وہ اس کے کبے بغیر خود ہی گھر آتے ہوئے تندور سے روٹیاں لگوا کے لے آتا۔ آج پتا نہیں کیسے وہ روٹیاں لانا بھول گیا تھا۔

”تو کھانا لگا، سالن وغیرہ گرم کر اور اگر اللہ توفیق دے تو کبھی چٹنی، سلاد بھی بنا لیا کر۔ چل اور کچھ نہیں تو

ایک کھیرا ہی کاٹ کے رکھ دے، میں روٹی پکڑ کے لایا۔“

”یہ چونچلے نہیں ہوتے میرے سے۔“ اس نے جاتے ہوئے سرتاج کی پشت کو گھورتے ہوئے با آواز بلند پکار کے کہا پھر اس کے پلٹ کے جواباً ”گھورنے پہ بوڑھے نے لگی۔“

”اچھا۔۔۔ لیکن کاٹوں گی نہیں، بس چھیل کے رکھ دوں گی۔“

”اور یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“ اس نے جل کے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا۔

اس وقت لقمان اور اصغری اپنے کمرے میں بیٹھے ایئر کولر کی ٹھنڈی ٹھنڈی نم ہوا کے مزے لیتے کھانا کھا رہے تھے۔ اصغری نے چنے کی دال کی کھجڑی بنائی تھی جس کے ساتھ یوکی کا رائتہ اور لیموں والی رنگ برنگی باریک کٹی سلاد تھی۔ ہری مرچ اور سوڑے کا اچار بھی تھا۔ چونکہ لقمان دوپہر کے وقت چپاتی ضرور لیتا تھا، اس لیے اس نے رات کا بچا ہوا آلو فیصے کا سالن گرم کر کے ساتھ دو پھلکے بھی ڈال لیے تھے۔ لقمان نے پھولے ہوئے گرم پھلکے کا لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

”کمال چیز ہو اصغری! پتا ہے، میں تو دوپہر کے کھانے کا مزہ ہی بھول گیا تھا۔ روز بازار سے نان کے ساتھ حلیم، پکوڑے، چنے کھا کھا کے دل بیزار ہو گیا تھا اور رات کو بھائی جان کے ہاتھ کی پکی پکی تلی دالیں اور گلی سڑی سستی بے موسمی سبزیوں کے شوربے دار سالن۔۔۔ جب سے تیرے ہاتھ کا چسکا لگا ہے، دکان چھوڑ کے بھاگا بھاگا کھانا کھانے آتا ہوں۔“

اصغری دل ہی دل میں پھولے نہیں سمائی مگر انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکا کے کسی نیک پروین بی بی کی طرح اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے مدھم سرول میں کہنے لگی۔

”یہ تو آپ کی محبت ہے جان جی! ورنہ میں ناچیز کس قابل یا شاید یہ بات ہو کہ آپ کے لیے پکاتے ہوئے میں مسالہ نہیں کھانے میں پیار گھولتی ہوں۔“

”میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔“ لقمان نے



خوش دلی سے کہا۔

”بس اپنی اپنی قسمت ہے، ورنہ حاتم بھائی صاحب کو ہی دیکھ لو، ساری عقل مندی دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ بڑا خود کو ہشیار چالاک سمجھتے تھے۔ کہتے تھے میں تو دنیا جیب میں ڈالے پھرتا ہوں اور اب زنانی خیر سے ایسی ملی ہے کہ اس نے ان کو ہی ڈبی میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔ سارے کس بل نکل کے رہ گئے۔ دھوپ میں جلتے بجھتے گھر آئے ہیں اب پھر نکلتا پڑا ہے۔ دس پندرہ منٹ تندور کی آگ کے پاس منہ سینکنے کے بعد چار روٹیاں لگوا کے لائیں گے، وہ بھی سخت اور اکڑی ہوئی۔ کھا کے معدہ ہی چیخیں مارنے لگ جاتا ہے اور پھر ہماری بھر جانی صاحبہ نے جو سالن پکایا ہوگا، واہ جی واہ۔ ایسے اچھوتے اور وکھری ٹائپ کے آئیڈیے ان کو ہی آسکتے ہیں۔ کبھی بینگن چاولوں میں ڈال کے عجیب لئی جیسا تلخوبہ بنا کے اسے ”بتاؤں پلاؤ“ کا نام دیا جاتا ہے۔ کبھی شاہجی کے گول قتلے کاٹ کے پاپڑ کی طرح تل لیتی ہیں اور اوپر نمک، چاٹ مسالہ چھڑک کر اسے فخر سے ”گو نگو کباب“ کہا جاتا ہے۔ اس دن پالک میں اروی ڈال کے پکائی ہوئی تھی اور وہ بھی شور بے والی۔ پرسوں تو رومہ مسالے کا پورا پیکٹ ڈال کے مسور کی ٹڑکے والی دال پکائی تھی۔ آج پتہ نہیں کیا چن چاڑھا (چاند چڑھا) ہوگا۔“

اس نے منٹوں میں دونوں چپاتیوں کا صفایا کرنے کے بعد اب چاول کی ڈش اٹھائی۔

”پیٹ تو بھر گیا ہے لیکن اتنی خوشبودار کھجڑی کونہ کھانا زیادتی ہوگی۔ ویسے بھی نیت تو ابھی نہیں بھری نا۔ چلو دو چار چمچے چکھ ہی لیتا ہوں۔“

”میں نے ایویں تین پاؤ چاول ڈال دیے۔ میرا پیٹ اور نیت تو آپ کی تعریفوں سے ہی بھر گئے۔ مشکل سے آدھی پلیٹ کھائی گئی ہے۔ رات کے لیے رکھنے کے بعد بھی چاول بچ جائیں گے۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ رزق کا زیاں۔۔۔“

”کسی مانگنے والے کو دے دینا۔ ساری دوپہر ہی دروازے کھڑکاتے پھرتے ہیں کم بخت۔“ اس نے

دو چار چمچوں کا کہہ کے آدھی ڈش پلیٹ میں نکال لی۔  
”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ کہہ ہی اٹھی۔

”ایک پلیٹ چاول نکال دیتی ہوں، انہیں دے دو، تمہارے بھائی جان کو کتنے پسند ہیں۔“ اس نے جان بوجھ کر حاتم کا نام لیا، ورنہ چاولوں کے لیے تو اکبری جان دیتی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ اب وہ اپنے گھر بار والے ہیں۔ اپنا اپنا پکانا ہے اور اپنا اپنا کھانا ہے، یہی طے ہوا تھا۔“

”لوگ ہمسایوں کو بھی تو دے دیتے ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”ہاں اگر ہمسایوں سے تعلقات اچھے ہوں تو۔“ وہ اس سے بھی تیز لہجے میں بولا۔

”ضد نہیں کرتے سوہنے! دل میں اتنی کدورت پالنا اچھی۔۔۔“ وہ تیزی طراری کو بے کار جان کے اب اپنے سدا بہار ہتھکنڈے پہ اتر آئی مگر اس سے پہلے کہ یہ بیٹھا وار نشانے پہ بیٹھتا، اچانک کچن سے کچھ عجیب سی آوازیں آئیں۔

”یا اللہ خیر۔۔۔ یہ باورچی خانے میں کیا سیلایا پڑ گیا۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”کچھ نہیں، کوئی چیز گری ہوگی۔“ لقمان نے لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہاتھ پکڑ کے واپس بٹھایا۔

”ہاں۔۔۔ کوئی کانچ کی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ شاید گلاس ٹوٹا ہوگا۔ وڈی کے ہاتھ میں تو سوراخ ہے ایسے ہی چیزیں توڑتی رہتی ہے۔“

”کانچ کی چیز کے ٹوٹنے کی آواز چھن کے ساتھ آتی ہے جبکہ میرے کانوں تک ٹھاہ اور دھڑام کی آوازیں آتی ہیں۔ لگتا ہے دیکچے یا کوئی اور بھاری چیزیں بھی گرا رہی ہیں تمہاری ”کامی“ (سکھڑ) بہن نے۔“  
”نہیں جی۔۔۔ صرف چھن کی آواز آئی تھی۔“

”لگالو شرط۔۔۔ یہ جو کانوں پہ بالوں کے گلدستے بنا کے گرائے ہوئے ہیں نا، انہیں اٹھا کے سنا ہو تا تو ٹھاہ



اور دھڑام بھی سنائی دیتا۔ ”وہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔“  
”بھی دیکھ کے آتا ہوں۔“

چند سیکنڈ بعد اس کی واپسی عجیب فاتحانہ سی چال کے ساتھ ہوئی۔

”دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا۔“ وہ جتاتے ہوئے پھر سے فرشی دسترخوان پہ پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا اور اپنی کچھڑی والی پلیٹ پہ دل جمعی کے ساتھ سلا د اور رانتے وغیرہ کی آرائش کرنے لگا۔ چند سیکنڈ صبر کے ساتھ اصغری نے اس کا ردائی کو دیکھا اور پھر بے تابی سے پوچھنے لگی۔  
”کیا ہوا تھا؟“

”ٹرے تمہاری بہن کے ہاتھ میں تھی ٹرے ملنے سے اس پہ رکھا پانی سے بھرا جگ نیچے گر کے چکنا چور ہو گیا۔“

”دیکھا“ آخر میری بات ہی صحیح تھی۔“ اصغری اپنے درست انداز سے گردن اکڑا کے بولی۔  
”غلط۔ تم نے گلاس ٹوٹنے کی بات کی تھی۔“  
اس نے چاولوں سے بھرے منہ کے ساتھ بمشکل فقرہ ادا کیا۔

”جی نہیں“ میں نے کانچ کی چیز ٹوٹنے کا کہا تھا، چھن کی آواز ایسی ہی چیز کے ٹوٹنے سے آتی ہے۔ آپ تو جی پتہ نہیں کون سے ٹھاہ دھڑام کر رہے تھے۔“

”غلط میں بھی نہیں تھا اصغری جی!“ لقمان نے ایک اور چمچ منہ میں ٹھونسنا۔ اچھی طرح جگالی کرنے کے بعد بتایا۔

”اس کے بعد پورے کا پورا ٹرے بھر جانی کے ہاتھ سے نیچے جا گرا۔ یہ ٹھاہ کی آواز اسی اسٹیل کے ٹرے اور ڈونٹے کی تھی۔“

”ہائے۔ ہائے۔ پورا ٹرے۔۔۔ سالن بھی گر گیا ہو گا؟۔“

”صرف سالن۔۔۔؟ اس نے پانی کا گھونٹ بھر کے لقمہ نگلا۔ انگلی کے ساتھ رانتے کے پیالے کے کنارے چائے اور سکون سے دو تین ڈکاریں لینے کے بعد انکشاف کیا۔

”بھر جانی خود بھی پوری کی پوری نیچے آن گری۔ وہ آخری دھڑاک والی آواز اسی کے وجود کے گرنے کی تھی۔“

اصغری پہلے تو منہ اور آنکھیں دونوں پوری طرح بھاڑے اپنے مجازی خدا کے سکون بھرے انداز پہ غور کرتی رہی اور پھر چلا اٹھی۔

”اور آپ اب بتا رہے ہیں“ آدھی پلیٹ صاف کرنے کے بعد۔ وہ وہاں گری ہوئی ہے اور خود اتنے آرام سے اپنے اندازوں کی درستی پہ واہ واہ کر رہے ہیں۔“  
وہ ایک بار پھر اٹھی مگر لقمان نے دوبارہ اسے کھینچا۔  
”اس کا شوہر اسے ”ڈھو“ کر کمرے میں لے جا چکا ہے۔“

”ڈھو“ کر؟“

”ہاں تو کیا اٹھا کے لے جاتا؟ تاکہ خود بھی اٹھ جاتا۔“

”میں ذرا دیکھ کے تو آؤں۔“ وہ بار بار اٹھ کھڑی ہوتی۔

”بیٹھ جاؤ آرام سے۔ کوئی ضرورت نہیں بڑی اکڑے ان دونوں میں۔ میں آگے آیا تو بھائی صاحب تن کے بولے“ اپنے کام سے کام رکھو“ اب اگر ہمیں — بھی کچھ التاسیدھا کہہ ڈالا تو آج اس گھر میں چاقو چھریاں نکل آئیں گی۔“  
وہ ٹھنڈی ہو کے بیٹھ گئی۔



اکبری بہت دیر سے تیار ہو کے بیٹھی تھی۔ آج اسے ہسپتال ماہانہ چیک اپ کے لیے جانا تھا اور بے کا انتظار تھا۔ ”لگتا ہے بے آگئی۔“ وہ چادر سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ حاتم جو ڈیوڑھی کے نزدیک برآمدے میں کھڑا شیو بنا رہا تھا، داخلی دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”بیٹھ جا۔۔۔ بیٹھ جا۔۔۔ کوئی نہیں دروازے پہ۔“

”رکشے کی آواز آئی ہے۔“

”یہ رکشے کی آواز نہیں۔ چھوٹا اندر کھنکھار رہا



ہے، شاید غرارے کر رہا ہے، کھالی ہوگی اپنی دکان کی کھٹی دی۔ اس نے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔

”اتنی دیر لگادی بے بے نے۔ اب تک تو بڑا رش ہو گیا ہوگا۔ سرکاری ہسپتالوں کا یہی تو سیپا ہے۔ مفت کا جان کے سارا شر آجاتا ہے اب تک تو سو عورتیں تو آچکی ہوں گی۔ میں کئے دیتی ہوں حاتم جی! اگر اور پندرہ منٹ تک بے بے نہ آئی تو آپ مجھے لے کے جا میں گے چاہے دفتر سے چھٹی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کیونکہ ڈاکٹرنی دو بجے تک بیٹھتی ہے۔ میں ساڑھے بارہ بجے وہاں جا کے پرچی بنوا بھی لوں تو باری آتے آتے دو سے اوپر کا وقت ہو جائے گا۔“

”اگر میرے ساتھ ہی جانا تھا تو پہلے بتائیں، میں اب تک مجھے دکھا کے واپس بھی لے آتا۔ کیونکہ آج میری ڈیوٹی ساڑھے کیا رہے دن سے لے کے رات کے نو بجے تک کی ہے۔ اور اب بس میں نکلنے ہی والا ہوں۔ صبح سے فارغ بیٹھا تھا۔ بڑے چاہ اٹھ رہے تھے بے بے کے ساتھ جانے کے۔ بھول بھال گئی ہوگی بے بے یا پھر سفارتی دورے پہ کہیں نہ کہیں نکل گئی ہوگی حسب معمول۔“

”پانی جان حاتم۔“ برابر والوں کے گیارہ سالہ ماجو نے دروازے سے گردن نکال کر آدڑ دی۔

”چل اوئے شکل گم کر۔ اب نہیں ملنے والی تیری گڈی۔“ کل دوپہر کو حاتم نے چھت سے اس کی پٹنگ کوئی تھی، سمجھا کہ وہی مانگنے آیا ہوگا۔

”وہ تو مجھے پتا ہے، میرا تیس روپے والا گڈ الوٹ کر آپ چھ روپے میں بیچ آئے ہو۔ ادھر تو میں بھالی جان کو پیغام دینے آیا تھا۔“

بھالی جان۔ نے زمانے بھر کی اکٹا ہٹ اور بیزاری چہرے پہ سجا کے اسے دیکھا۔ وہ دن میں ایک آدھ بار تو ضرور اپنی اماں کے پیغام لایا کرتا تھا۔

”نمائز منگے ہو گئے ہیں، میں نے منگوانے چھوڑ دیے ہیں، آلو میٹھے نکلے تھے، ریڑھی والے کے منہ پہ واپس مار دیے، چینی آج صبح ہی ختم ہوئی ہے اور آٹے والا کنستری جھاڑ کے ابھی کنتی کے چار پیڑے گوندھ کے

رکھے ہیں۔ اور کچھ چاہیے تیری ماں کو۔ تو بتا، اس کا بھی حساب دیتی ہوں۔“

”میں یہاں مانگنے شانگنے نہیں آیا۔ پیغام دینے آیا تھا اور وہ بھی اپنی اماں کا نہیں، حاجی صاحب کی بیوی کا وہ کہہ رہی تھیں؟ اکبری باجی کو کہنا، ان کی بے بے کی طبیعت خراب ہے، وہ نہیں آسکتی، آپ کے ابا نے حاجی صاحب کے گھر فون کر کے بتایا ہے۔“ وہ بھی پیغام منہ پہ مار کے چلا گیا۔

”ہائے ہائے بے بے کو بھی وقت بے وقت طبیعت خراب کرنے کی سوچھتی ہے۔ ان کا ریکارڈ ہے، ہمیشہ اسی وقت بیمار پڑی ہے جب نہیں ہونا چاہیے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اکبری! بھلا کوئی بیماری بھی بتا کے آتی ہے کہ اسے دروازے پہ روک لیا جائے یہ کہہ کر کہ لی بی، ابھی وقت ہے نہ مناسب موقع، کسی اچھے دن فرصت میں آنا تو سواگت کریں گے۔“

”اب میں ہسپتال کیسے جاؤں، کس کے ساتھ جاؤں؟“ وہ کن اکھیوں سے اصغری کے نیم وادروازے کی جانب دیکھتے ہوئے با آواز بلند واویلا مچانے لگی۔ حاتم اس کا مطلب بھانپ گیا۔

”کل لے جاؤں گا۔ ادھر ادھر آس لگانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں کسی کا احسان نہیں چاہیے۔“ اس نے گھر کا۔ لقمان تو لیے سے منہ رگڑتا ہا ہر نکلا۔

”انکار اس چیز کو لینے سے کرتے ہیں جو دی جا رہی ہو۔ تم یہ یا تمہاری بیوی پہ احسان کر کون رہا ہے جو تم اتنی اکڑ دکھا رہے ہو۔“

”اوئے تیری ہمت اتنی بڑھ گئی کہ اب میرے منہ لگ رہا ہے۔ سچ ہے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“ حاتم بھڑک اٹھا۔

”کیا...؟ کیا...؟ تم نے مجھے اور میری بیوی کو خربوزہ کہا؟ خربوزہ تو تمہارے ماتھے پہ سجا ہوا ہے۔“ اس نے بھائی کی چمکدار ٹنڈ کو دیکھ کے کہا۔

”اتنی گستاخی؟ اس قدر بے ادبی۔ اس حد تک بد لحاظی اور زبان درازی۔“ وہ جلال میں آ کے پوری لغت



”کھول کے بیٹھ گیا۔“  
”دیکھا اکبری! تمہاری بہن نے کیسے میرے  
سیدھے سادے بھائی کو جلیبی جیسا کر دیا ہے، کیسے اپنا  
اثر ڈال کے اسے بد تمیز اور بد زبان بنا دیا ہے۔“  
”یہ آپ اپنے بھائی کے ساتھ لڑائی میں بار بار  
اصغری کو کیوں گھسیٹ لیتے ہیں۔“ اکبری کو تکلیف  
ہوئی۔

”تم ہی تو کہتی ہو کہ اس جیسی چالاک فطرت اور  
بد لحاظ کوئی اور نہیں۔ اگر میں نے کہہ دیا تو کیا فرق پڑ گیا  
ویسے بھی یہ غلط نہیں، سامنے کی بات ہے پہلے اسی  
لقمان کے منہ میں گویا زبان نہیں ہوتی تھی اور اب دو  
دو زبانیں فٹ ہو گئی ہیں۔ وہ بھی تیز دھار۔“  
اکبری کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔  
حاتم کے نکلنے کے بعد بھی وہ دیر تک صحن میں  
بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ جب حاتم بھی دکان پہ چلا گیا تو  
اصغری کمرے سے نکلی۔ جھاڑو اٹھائی اور صحن میں  
پھیرنے لگی۔ ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے اکبری کا  
جائزہ لیا جاتا رہا۔ چند منٹ تک جب وہ مسلسل ایک  
ہی جگہ سے دھول اڑاتی رہی تب اکبری نے گھور کے  
دیکھا۔

”یہاں سے فرش گھسنا ہے کیا؟“

”اب اپنے نہ جانے کا غصہ مجھ پہ کس لیے نکال  
رہی ہو؟“ پتا نہیں اس کے لہجے میں اداسی تھی یا کچھ  
اور۔۔۔ کہ غصے سے بھری اکبری کا دل موم ہو گیا۔ اس  
نے بہت دنوں کے بعد اسے غور سے دیکھا۔ صحت تو  
پہلے ہی خاص قابل رشک نہ تھی، اب عجیب زردیاں  
سی گھلی نظر آرہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے۔۔۔  
”یہ تیری شکل کو کیا ہوا ہے؟ اچھا بھلا منہ، فٹ منہ  
ہو کے رہ گیا؟“

جو سوال اکبری اس بغور معائنہ کے بعد کرنے ہی  
والی تھی، وہ سوال اس سے پہلے اصغری نے داغ دیا۔ وہ  
بھی اسی غور کے ساتھ اس کا چہرہ کھوج رہی تھی۔  
جہاں بھوری بھوری جھائیوں کے سائے پیدا ہو چکے  
تھے۔

”ارے۔۔۔“ نرا کھانا پینا تو سب کچھ نہیں ہوتا۔  
اس کے سرو آہ بھر کے کہنے پہ اصغری بے ہوش  
ہوتے ہوتے پئی۔ یہ فرمان اسی اکبری نے نشر کیا تھا،  
جس کا قول تھا، زندگی ہے ہی صرف کھانے پینے کے  
لیے۔

”دکھ بندے کو کھا جاتے ہیں، اس کا ماس چاٹ  
جاتے ہیں۔“ اس نے دوپٹے سے رگڑ کے دو آنسو  
زبردستی باہر نکالے۔  
”سچ کہتی ہو وڈی۔“ وہ جھاڑو پھینک کے اس کے  
برابر بیٹھ گئی۔

یوں تو اپنے اپنے شوہروں کے جانے کے بعد دونوں  
ہی گھر میں اکیلی ہوتی تھیں، چاہتیں تو ان کے علم میں  
لائے بغیر اپنی مشہور عالم سرگرمیاں باہمی طور پر پہلے کی  
طرح جاری رکھ سکتی تھیں، لیکن پہلے تین چار دن تک  
تو دونوں بھائیوں کی اچانک پھوٹی نا اتفاقی پہ حیرت نے  
یہ قدم نہ اٹھانے دیا۔۔۔ جب یہ نا اتفاقی بڑھتے بڑھتے  
زبردست خانہ جنگی تک پہنچ گئی تو دونوں بوکھلا کے رہ  
گئیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ دونوں بھائی آپس کی تو تکار  
میں ہمیشہ ان دونوں کو گھسیٹ لاتے اور ہر نئے جھگڑے  
کا سرا ان ہی دونوں کے سر باندھا جاتا۔ اس لیے  
مارے احتیاط کے پچھلے دس پندرہ روز سے وہ چاہنے  
کے باوجود ایک دوسرے سے تعلقات بحال نہ کر سکیں  
کہ حاتم اور لقمان دونوں سخت تیوروں کے ساتھ ان کو  
وارننگ دے چکے تھے کہ جب تک ہماری ”جنگ“  
جاری ہے۔ صلح کا خیال بھی کسی کے دل میں نہ آئے۔  
ویسے تو دونوں بڑی جی دار تھیں، حاتم اور لقمان کے  
احکامات کو کیا خاطر میں لاتیں، اکبری بے جگری  
سے۔۔۔ تو اصغری سیاست سے اپنے اپنے شوہر کی  
ہدایات ان کے منہ پہ الٹنے میں ماہر تھی، لیکن اب  
معاملہ دوسرا تھا۔ یہ میاں بیوی کی روزمرہ کی معمولی  
نوک جھونک یا جھڑپ نہیں تھی۔ دو بھائیوں کا تازہ  
تھا جو دن میں دس بار نئی آب و تاب کے ساتھ زندہ



ہو جایا کرتا تھا۔ وہ مصلحتاً ”چپ تھیں اور انتظار کر رہی تھیں کہ خود ہی ان کے دل صاف ہو جائیں تو بہتر ہے۔ لیکن یہ انتظار تھا کہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ اب دونوں میں ہی صبر کا مادہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آج اصغری سے رہا نہ گیا وہ اسے مغموم دیکھ کے دلا سا دینے پاس آ ہی بیٹھی۔

”کیوں فکر کرتی ہے بے بے نہیں آئی تو نہ سہی“ میں چلی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔“

”اور تیرا بندہ؟ وہ تو صاف کہتا ہے کہ اگر تو نے میرے ساتھ تعلق واسطہ رکھا تو وہ تیری ایسی کی تیری کر کے رکھ دے گا۔“

”ہونہ“ اتنی ہمت اور وہ بھی لقمان میں؟ اسے تو ایسی کی تیری کرنے کا مطلب تک نہیں آتا۔ ایسی کی تیری تو اب میں کروں گی ان پابندیوں کی میں ذرا کپڑے بدل کے آئی پھر لے جاتی ہوں تجھے ہسپتال۔“

”دیکھ لے پچھلی باری کی طرح رشتے کے کراسے پر لڑنا مت۔“

”بھئی یہ تو انصاف کی بات ہے جب ہم دونوں خریداری کرنے یا سیر سپاٹا کرنے نکلتے ہیں تو دونوں طرف کا کرایہ آدھا آدھا دیتے ہیں لیکن اگر میں تیرے کام سے جا رہی ہوں تب تو دونوں طرف کا ہی کرایہ تیرے ذمے ہونا چاہئے تو تو وہ بھی میرے متھے مار رہی تھی۔“

”دیکھ۔ دیکھ۔ تو پھر پہلے کی طرح۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”اچھا چل چھوڑ دے دوں گی میں ایک طرف کا کرایہ۔ بلکہ تو بھی کیا یاد کرے گی کس سخی سے پالا پڑا ہے میں دونوں طرف کا کرایہ دے دوں گی۔“

”تیرا اتنا کہنا ہی کافی ہے میرا دل بڑا ہوا گیا۔“

”نہ۔ نہ۔ دل بڑا ہونا تو بڑی بری بیماری ہے۔ میں نے خود پر دھا تھا اخبار میں۔ بندہ بچتا نہیں۔“

”نی چل“ محول نہ کر۔ جلدی سے تیار ہو جا میں تجھے رستے سے چنے پھورے بھی کھلاؤں گی۔“

”ایویں چنے پھورے؟ وہ تو میرے لقمان جی مجھے ہر دوسرے دن کھلاتے ہیں۔ میں تو برگر کھاؤں گی ساتھ میں شیراز کی بوتل۔“

”اچھا شوخیے! جلدی تیار ہو جا“ نہیں تو ٹیم نکل جائے گا۔“ دونوں بعد اکٹھے نکلنے کی خوشی دونوں کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اصغری شتم شتم تیار ہو کے باہر نکلی۔ اکبری نے تعریفی نظروں سے اس کے نئے جوڑے کو دیکھا۔ کالے جارجٹ کے سوٹ۔ گلابی دھاگے کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ کالے رنگ کے لباس میں اس کا رنگ بھی صاف لگ رہا تھا۔

”نیا جوڑا۔۔۔؟ خود کڑھائی کی ہوگی؟“

”لے لے تو اور کیا؟ اس لیے تو ہنر نہیں سیکھا کہ بازاروں میں پیسے برباد کریں۔۔۔ تیری طرح۔ تو اپنی پسند کا رنگ لے آ میں تجھے بھی ایسا ہی بنا دوں گی۔“

آج وہ حد سے زیادہ فیاض اور خوش اخلاق بن رہی تھیں۔ گھر کو تالا لگا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ دونوں نکلنے ہی والی تھیں کہ لقمان آ گیا۔

”کہہ ہر کی تیاری ہے؟“ اس نے اس خوفناک انداز میں ڈیلے نکال کے اصغری کو گھورا کہ وہ ایسی کی تھی کرنے کا سارا فن بھول گئی۔

”دوس۔ میں۔۔۔ میں اکبری کو میں اکبری کو اسپتال۔“

”کس کی اجازت سے؟“ اس نے بیوی کے ہاتھ سے چابیوں کا گچھا چھینا اور دروازے کا تالا کھولنے لگا۔

”لقمان جی!“ اصغری نے ہونٹ لٹکا کے اداؤں کے تیر چلانا چاہے۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ میری

اصغری بڑی سیانی ہے اور مجھے اس پہ پورا اعتماد ہے۔

آپ نے ہی تو مجھے اجازت دی تھی کہ میں جب بھی

چاہے کسی بھی کام سے باہر آ جا سکتی ہوں۔“ اس نے

آنکھیں مٹکا مٹکا کے بھولا بسرا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں مگر یہ اجازت نہیں دی تھی کہ کسی کے بھی

ساتھ چلی جاؤ۔ اپنے کسی ضروری کام سے بے شک

جاؤ میں شک کرنے یا روکنے ٹوکنے والا مرد نہیں لیکن



دوسروں کے کاموں کے لیے گھر پہ تالے لگا کے سڑکوں پہ خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری طبیعت اتنی خراب ہے میں ذرا دیر بعد گھر پہنچتا تو اس منحوس کالے تالے سے ہی سر پھوڑ رہا ہوتا اور تم دشمنوں کی سیوا میں مصروف ہوتیں۔

اس نے پاؤں کی ٹھوک سے لکڑی کے دروازے کو دھکیلا۔ وہ شوہر کے پیچھے پیچھے لپکی۔  
”دشمن کون؟ میں اپنی بہن کے کام نہیں آؤں گی تو کون آئے گا۔“

”میرا پورا حق ہے اصغری یہ۔ وہ تیری بیوی بعد میں بنی ہے۔ پہلے میری بہن ہے۔“ اکبری بھی شیر ہوئی۔  
”بھرجائی! میرا منہ نہ کھلاؤ۔“

”کیوں تیری دائرہ میں درو ہے؟“ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے باقاعدہ لڑنے کو تیار تھی۔

”ہاں میں پوچھتی ہوں تم دونوں بھائی چاہتے کیا ہو؟ آپس کی لڑائی میں ہم بہنوں کو کیوں چھروانا چاہتے ہو۔“

”اس لیے کہ تم دونوں ہمیشہ پہلے تھیں اب ہماری بیویاں ہو۔ ہماری لڑائیوں کا اثر تم دونوں پہ پڑتا ہی پڑتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے تم دونوں کی حج حج کا اثر ہم پہ پڑ گیا۔ اب بھگتو۔“

بھابھی کی زبان بند کروا کے وہ پھر بیوی کی جانب پلٹا۔

”چلو اپنے کمرے میں آئندہ تمہیں ہرگز اپنے دشمنوں سے بہنایا جوڑتے نہ دیکھوں۔ تم نے اب تک میرا پیار دیکھا ہے غصہ نہیں۔“

وہ ”مولا جٹ“ کی طرح پیترے بدل بدل کے دھمکا رہا تھا۔ اکبری سر بھٹکتی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اصغری بھی ناگوار نظروں سے اسے بس دیکھ کے رہ گئی۔



اگلے دن ابے کی آمد ایک نئے تنازعے کو جنم دے گئی۔ نہ صرف تنازعہ بلکہ ابے کی آمد کے جلو میں

ایک تہلکہ خیز خبر بھی تھی۔

”تمہاری بے بے کل رات سے ہسپتال میں ہے، بڑا سخت دورہ پڑا ہے۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو ”دیکھا“ آخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آئی گیا۔

اکبری تو وہیں تیورا کے گرنے لگی تھی صدمہ تو اصغری کو بھی تھا مگر فی الحال اکبری کی فکر غالب آگئی۔

ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ وڈی۔۔۔ ہوش کر۔۔۔ وہ اس کے ہاتھ سہلانے لگی۔

”کوئی ٹھنڈا پانی لاؤ۔۔۔ کوئی دودھ میں روح افزا ڈال کے دو۔“ اس کے واویلے پر ابے نے متانت سے تکلف نبھایا۔

”نہیں نہیں، میں ناشتہ کر کے نکلا ہوں، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔“

”ہائے ابا! میں وڈی کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”اسے سنبھالنے کے لیے میں کافی ہوں۔“ حاتم نے دخل اندازی کی۔ ”تم اپنے بندے کو سنبھالو، غسل خانے کے دروازے سے (سر) نکال نکال کے تولیے کے لیے آوازیں دے رہا ہے۔“ اسے چلتا کرنے کے بعد وہ اکبری کو ہوش میں لانے کے لیے حربے آزمانے لگا۔

”لے ابا تو مذاق کر رہا تھا، وہ دیکھ بے بے رکشے سے اتر رہی ہے، ہاتھ میں بھٹہ پکڑا ہے۔“

”چل شاباش، میری اکبری تو بڑی بہادر ہے، وہ ذرا ذرا اسی بات پہ دل نہیں لیتی۔“

اللہ اللہ کر کے اکبری نے آنکھیں کھولیں، ٹھنڈے ٹھار دودھ کا گلاس حاتم کے ہاتھ سے غٹا غٹ چڑھایا۔ ادھر اصغری کمرے سے چادر لپیٹے اور لقمان تولیہ کاندھوں پہ ڈالے برآمد ہوا۔

”ہائے ابا! یہ کیا ہو گیا؟“ اسے ابھی ابھی اصغری سے اس سانے کا پتا چلا تھا، سوا بے سے لپٹ گیا۔

”ابھی ہوا کب ہے پتر۔“ ابے نے مایوسی سے آہ بھری۔ ”ڈاکٹر کہتے ہیں، خطرہ ٹل گیا ہے۔“ اس کے لہجے میں افسوس ہی افسوس تھا۔

”تم لوگ خیر سے اپنے اپنے کام پر جاؤ۔ کہاں



سورے سورے دھندا بند کر کے ہسپتالوں میں خوار ہو گئے۔ آرام سے شام کو سانس کو دیکھنے آجائے۔ اصغری اکبری میرے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ ان کو حوصلہ ہو جائے گا میں ذرا گھر جا کے ”لگ“ (کمر) سیدھا کر لوں، زنانہ وارڈ میں رات کو اندر تو جا نہیں سکتا۔ یہ لڑکیاں ماں کی سیوا کر کے دعا لے لیں۔“

”دعا ضرور لیں، ثواب بھی ضرور سمیٹیں ماں کی خدمت کرنے کا، ہمیں کیا اعتراض ہے لیکن ثواب لینے کی باری مقرر ہوگی۔ یہ اکٹھی ہسپتال نہیں جائیں گی۔“ حاتم کے فیصلے کی لقمان نے سر ہلا کے تائید کی۔ ”بس یہ طے ہے جہاں بھر جائی جائے گی وہاں اصغری قدم نہیں رکھے گی چاہے وہ ان کا میکہ ہی کیوں نہ ہو۔“

”یہ کون سا نیا قانون ہے؟“ لبا بکا بکا تھا۔ وہ دونوں بھی اس شدت پسندی کے مظاہرے پہ ششدر تھیں، انہیں توقع نہیں تھی کہ اس نازک اور سنگین صورتحال میں بھی وہ دونوں یہ مسئلہ کھڑا کریں گے۔ ”یہ نیا نہیں، بیس دن پرانا قانون ہے سوہرا صاحب (سرجی)۔“

”ہائے آبا؟“ اصغری نے حسب عادت ہائے بلند کی۔

”یہ کن سودائیوں کے متھے مار دیا ہے اپنی بھولی بھالی لڑکیوں کو۔ ان کے مغز پھر گئے ہیں۔ سگے بھائی اک دو بے کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اور تو اور ہم دونوں یہ بھی روک ٹوک لگاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں۔ بتا لبا، بھلا یہ ہو سکتا ہے ساری دنیا جانتی ہے اکبری، اصغری ایک جان دو قالب ہیں، منٹ کے لیے جدا نہیں ہو سکتیں۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ لبا ذہن پر زور ڈال کے سوچنے لگا۔

”یہ کوئی دو تین ہفتے پہلے کی بات ہے جب معمولی سے جھگڑے کو ان دونوں نے۔۔۔“ اکبری تفصیل میں جانے والی تھی کہ لبا نے ٹوک دیا۔

”نہیں میں یہ ایک جان دو قالب والے واقعے کے

بارے میں پوچھ رہا ہوں، یہ کس صدی کا قصہ ہے، میں نے تو اتنے سالوں میں ایسی کوئی افواہ نہیں سنی۔“

”پرانی باتیں چھوڑیں سوہرا صاحب۔“ حاتم نے ہاتھ اٹھا کے اپنا فیصلہ دہرایا۔

”وہ عورتوں کے جھگڑے تھے، روز پیدا ہونے والے اور روز مرنے والے۔ مگر اب یہ مردوں کی جنگ ہے اور بیوی ہونے کے ناتے ان کا فرض بنتا ہے کہ اس جنگ میں اپنے اپنے شوہر کا پورا ساتھ دیں۔ مشرقی بیوی بن کے دکھا میں۔“

”مشرقی وفادار بیوی بننے کے لیے کیا یہ ضروری ہے پائی جان! کہ اپنی سگی بہن کا سر پھاڑا جائے؟ اصغری نے دریافت کیا۔

”نہیں تشدد کے تو میں بھی خلاف ہوں۔“ حاتم نے چکے سر پہ کھردرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”بہر حال جہاں اتنے سالوں سے تم دونوں اپنے اپنے مسئلوں پہ لڑ رہی ہو، وہاں ہمارے لیے لڑنے میں کیا بُرائی ہے۔“

”وہ کوئی لڑائیاں ہیں، وہ تو بہنوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔“

”مگر اس چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں ہم مردوں کا گرم خون بری طرح ”چھڑ“ چکا ہے اس کا خمیازہ تو تم دونوں کو بھگتنا ہی پڑے گا۔“

”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ ابے نے اس بے مقصد بحث سے اکتا کے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

”کس نے میرے ساتھ جانا ہے؟ وڈی نے یا نکلی نے؟“

”ماں ہم دونوں کی سانجھی ہے، پھر ہم باری سے کیوں جائیں۔“ وہ اپنے موقف پہ قائم تھیں۔

”یہ گھر بھی تم دونوں کا سانجھا تھا، تب یہ بات نہ عقل میں آئی۔“ حاتم نے جتایا تو دونوں کو یک دم چپ لگ گئی۔

”چلیں سوہرا صاحب! میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ، وہاں سے سیدھا دفتر چلا جاؤں گا، چھوٹے نے آنا ہوا تو اپنی بیوی کو لے کر شام کو آجائے۔ اکبری کی



طبیعت ٹھیک نہیں وہ کل آجائے گی۔  
 ”ہائے میری بے بے۔“ اکبری پچھاڑیں کھانے لگی۔

”میں بے بے کے پاس جاؤں گی۔ میں نے بے بے کو دیکھنے جانا ہے۔“ اس کی چیخ و پکار یہ کان نہ دھرتے ہوئے حاتم ابا کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ اتنے میں لقمان بھی لباس تبدیل کر آیا۔

”فکر نہ کر اصغری! میں تجھے شام تک انتظار نہیں کروں گا ذرا دکان پہ اک نظر مار کے آتا ہوں ملازم سنبھال لیں گے۔ تو تیار رہنا۔“

”لیکن لقمان جی! وہ وڈی۔ اس کی بھی تو بے بے ہے! اے دیکھے بغیر کل تک چین کیسے آئے گا۔“

”میں مجبور ہوں اصغری ابھر جانی کو ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“ وہ بھی صاف جواب دے کے چلتا بنا۔ اکبری بہن کے گلے گلے کسکتے لگی۔

”پتہ نہیں بے بے کی کتنی طبیعت خراب ہوگی۔ ساری رات وارڈ میں اکیلی پڑی رہی ہوگی۔“

”کیوں فکر کرتی ہے وڈی! پتہ تو ہے بے بے کی عادت کا۔ منٹوں میں سہیلیاں بنا لیتی ہے۔ رات کی رات میں سارا وارڈ پیچھے لگا لیا ہو گا۔“

”لیکن اپنی اولاد کی بات اور ہوتی ہے۔ جو خدمت ہم کر سکتے ہیں وہ کوئی کیا کرے گا۔“

”میں جارہی ہوں ناں رات وہیں رہوں گی بس تو فکر نہ کر اپنا خیال کر۔“

”تجھے تو تسلی ہو جائے گی میرا کیا بنے گا میں کل تک کا دن کیسے گزار دوں۔ میرے پیٹ میں تو ابھی سے ”وٹ“ پڑ رہے ہیں۔“

”رات کو پکوڑے بھی تو تو نے دبا کے کھائے تھے۔“

”نہیں نی! یہ ”وٹ“ تو فکر اور پریشانی کے ہیں۔ کیا اس مشکل ویلے میں تو بھی میرا ساتھ نہیں دے گی۔ مجھے ایسے اکیلی چھوڑ کے بے بے کے پاس چلی جائے گی۔“

”میرا کیا ہے میں تو تجھے لے جاؤں لقمان جی سے

نمننا بھی میرے لیے مشکل نہیں زیادہ سے زیادہ کیا کر لے گا نئی نئی زبان لگی ہے تھوڑی بہت چلا لے گا وہ بھی میری اک نظر کی مار ہے۔ ادھر گھور کے دیکھا ادھر بولتی بند۔ ڈر تیرا ہے پائی جان ہے ذرا اوکھا (مشکل) اور ڈاڈا (خست) بندہ۔ تیری شامت نہ آجائے کہیں۔ ویسے بھی تیری خالی خولی باہر سے ہی صحت پہلوانوں والی ہے حوصلہ تو چو ہے جتنا بھی نہیں۔ یہ نہ ہو واپسی پی۔۔۔

”واپسی کی واپسی پہ دیکھی جائے گی۔“ اکبری نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔

”میری بے بے بیمار۔ پڑی ہے اور میں ڈرتی پھروں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کوئی سیر سپاٹا کرنے یا سینما دیکھنے نہیں جا رہی جو اجازت لوں اپنی ماں کو۔ بیمار ماں کو دیکھنے جا رہی ہوں یہ میرا حق ہے دیکھتی ہوں تیرے پائی جان کیا کر لیں گے۔ چل اٹھ بہت ہو گئیں ان دونوں کی ڈراے بازیاں زندگی کو پنجابی فلم بنائے رکھ دیا ہے ان بھائیوں نے ہر وقت ڈنڈے سوٹے چلانے کی باتیں۔“ اس نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور کھونٹی سے چادر اتار کے اوڑھی۔

رکشہ ابھی منزنگ چورنگی سے نکلا ہی تھا کہ اصغری نے حاتم اور لقمان دونوں کو ایک ہی پھٹپھٹی پہ شمع سینما کی طرف مڑتے دیکھا۔

”یہ دونوں اکٹھے۔ اور وہ اس طرف جبکہ ہسپتال تو چورجی کے پیچھے ہے۔“ اس نے اکبری کو متوجہ کیا۔ ”پاء رکشے والے ذرا رکشہ شمع کی طرف موڑنا“ اس موڑ سائیکل کے پیچھے پیچھے۔

پیچھے پیچھے چلتے وہ رحمان پورہ کی طرف آنکے جہاں بے بے کی بہن کا گھر تھا۔

”یہ ماسی رسولائ کی طرف کیا کرنے آئے ہیں؟“ ”ضروری نہیں ماسی کے گھر آئے ہوں کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے۔“ لیکن اصغری نے اکبری کے موقف کی پر زور تردید کی۔

”نہیں، نہیں، یہ کوئی لمبا چکر ہے۔ ایک تو اتنی لڑائی کے بعد دونوں اکٹھے۔ وہ بھی ماسی کی گلی کی طرف



وہ دیکھو وہی ماسی کے دروازے کے آگے ابے کی سائیکل کھڑی ہے، پاء رکشہ ادھر ہی روک دے۔“ اس نے گلی کے کونے پہ رکشہ رکوا لیا۔ دوسرے کونے پہ ماسی کے مکان کے ٹوٹے دروازے کے آگے ابے کی رینگیں جھنڈیوں والی سائیکل کھڑی تھی جس کے برابر حاتم نے اپنی چھپنی پارک کی جس کی نمبر پلیٹ کے اوپر ”دل تیرا دیوانہ“ لکھا تھا۔ ان کے اندر جانے کے بعد وہ دونوں رکشے سے نکلیں اور تیز تیز قدموں سے ماسی کے گھر کی طرف بڑھیں۔ دروازے پہ لگا چھینٹ کا اٹھارہ سالہ پرانا بے رنگ پردہ ہٹا کے دیکھا۔ سیلن زدہ نیم تاریک لمبی سی ڈیوڑھی خالی تھی البتہ کچے صحن سے آئی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

مرغیوں کی کڑکڑکی۔

بکریوں اور میمنوں کی میں میں کی۔ ماسی کے پوتوں کی ”تیری تو میں۔“ اور توبہ گا۔ جیسی کالم گلوچ کی آوازیں۔

بے بے کی بلغمی ہنسی کی آواز۔

ماسی کے حقے کی گڑگڑ۔

اور ان سب میں سے رستہ بناتی ابے کی آواز۔

”بھئی عنایت! سچ کہتی تھی تو میرے سوا سیر جوانی ڈھونڈے ہیں تو نے۔ میں تو سمجھتا تھا میری لڑکیوں کا جوڑ پورے جہان میں نہیں۔ لیکن تو نے یہ غلط ثابت کرویا۔ کیسے سارے کس بل گئے ہیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آ رہا ہوں۔“ پہلی بار ابے کے گہجے میں بے بے کے لیے تعریف و توصیف تھی۔

”یہ نا انصافی ہے۔ سارا منصوبہ میرا تھا، چھوٹا تو صرف وہی کرتا تھا جو میں کہتا تھا۔ ساری ساری رات اسے طوطے کی طرح رٹا لگوا دیا ہے تب جا کے بیوی کے آگے زبان کے زنگ کھلے ہیں ورنہ اس کی تو گھکھی بندھی رہتی تھی زن مرید کہیں کا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے بھائی جان! منصوبہ آپ کا تھا لیکن میں اتنی اچھی طرح عمل نہ کرتا تو آپ اکیلے ہوا سے لڑتے؟ میری اداکاری میں جان تھی اور میرے لیے یہ کام مشکل تھا۔ اصغری کو آنکھیں نکال کے گھر کنا جتنا

مشکل کام تھا، اتنا ہی مشکل آپ کے ساتھ بد کلامی کرنا بھی تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آپ کے لیے میرے دل میں کتنی عزت ہے، آپ سے جھوٹ موٹ کی بد تمیزی کرنے کے بعد بھی میرا دل گھنٹوں کڑھتا تھا۔“

”یہ ضروری تھا پتر!“ بے بے کی آواز سے کہیں نہ لگتا تھا وہ کبھی کسی زمانے میں بیمار بھی رہی ہوگی۔

”علاج کے لیے کبھی کبھی کڑوی دوا کا گھونٹ پینا پڑتا ہے۔ ان کو یہ سبق دینا ضروری تھا کہ کنوار پن کی شوخیاں اور ہلکی پھلکی لڑائیاں گھر بہتن عورت بننے کے بعد چھوڑنا پڑتی ہیں اور گھر کا ماحول ٹھیک رکھنے کے لیے صبر اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔“

”یہ سبق تو نے کسی سے کیوں نہ پڑھا عنایت!“ ابے نے سر د آہ بھری۔

”میں نے وہ ”وخت“ بھی نہ ڈالے تھے جو تمہاری بیٹیوں نے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ بیٹھی ہے میری بہن رسولائے پوچھ تو سہی، کبھی اونچ نیچ ہوئی ہے ہمارے درمیان۔ ہاں دیو رانی جٹھالی سے پھڈے بازی الگ معاملہ ہے۔ یہ دونوں تو بہن بہن ہو کے سو کنوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پہ لڑ پڑتی تھیں۔“

”بے بے کا کہنا ٹھیک ہے۔ ہمارے گھر کا ماحول بری طرح تباہ ہو رہا تھا۔ روز شام کو نحوست ڈیرے ڈالے ہوتی۔ اس کا بھی منہ پھولا ہوا، اس کا بھی سو جا ہوا۔ روز کی کل کل روز کے سیا پے، ان کا یہی حل تھا کہ ان کو ایسے ڈرایا جائے، یہ ڈرا دیا جائے کہ ان کی روز روز کی لڑائی، ہم دونوں کے درمیان جنگ کی صورت جنم لے سکتی ہے، ایک گھر دو محازوں میں بٹ سکتا ہے اور اس سے ان کے اس رشتے پہ بھی اثر پڑ سکتا ہے جس رشتے کا انہیں علم تو تھا، مگر اس کی نزاکت اور اہمیت کا احساس اب جا کے ہوا ہے۔ خوب زور دار معرکے کے بعد بھی یہ دونوں دو تین روز کے بعد سب بھول جاتی تھیں، ایک دوسرے کے بغیر رہا بھی تو نہیں جاتا تھا۔ لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ذرا ذرا بات یہ دوسرے کو ذلیل کر کے رکھ دینا بعد میں چاہے صلح ہو جائے مگر سارے محلے نے تماشا تو بغیر



ٹکٹ کے دیکھ لیا ہوتا ہے۔ اب یہ قصہ ختم ہو گا۔  
 ”اب یہ قصہ ختم نہیں ہو گا“ اس کی اگلی قسط شروع ہو گی۔ ”اس سے زیادہ سننے کی اکبری میں تاب تھی نہ حوصلہ وہ تیر کی طرح رابرداری عبور کر کے صحن میں آدھمکی اُصغری اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ابے کے منہ میں حقہ دبے کا دوبارہ گیا جو بڑے انتظار کے بعد ماسی رسولان نے بخشا تھا۔ بے بے کا تعریفی انداز میں جھومتا سر رک گیا ماسی بوکھلا کے سامنے رکھے میز سے شیشے کے گلاس اور جگ اٹھانے لگی کہ کہیں اس کے گھر کا یہ واحد و اثر سیٹ جو مہمانوں کے آنے پہ نکالا جاتا ہے، بطور ہتھیار نہ استعمال ہو جائے۔ اور حاتم کی ساری شیخیاں ہوا ہو گئیں۔

”یہ تھے منصوبے؟“ اُصغری نے لقمان کو لٹکارا۔  
 ”تو وہ ساری اداکاری تھی۔ میرا خیال تھا شاید نشہ وغیرہ کرنے لگے۔ وہ اس لئے متوجہ سے بے خبر ہو کے میرے آگے آئے۔“

”تم نے اُصغری کو تم نے تو میرا کوئی قصور نہیں یہ سارا بھائی جان کا۔“ وہ اٹھ کھڑا لگا۔  
 حاتم نے جلد خود کو صیلا گور پوری اس پہ سینہ زوری کے مترادف اکر لیا۔

”ہاں سب میرا یہ دھڑا ہے لیکن اس کی ذمہ داری تم دونوں ہو۔ اگر تم دونوں پیار سے سمجھنے والے ہو تم تو اس ڈرامے بازی کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مجھے بھی شوق نہیں تھا تو منتی سجانے کا مگر مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔“  
 ”اس کا نتیجہ الٹ بھی نکل سکتا تھا پائی جان!“  
 اُصغری نے احساس دلانا چاہا۔

”آج ہی ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ اس مکان کو بکوا کے اپنا اپنا حصہ الگ الگ کروائیں گی۔ ہم دونوں خود تنگ آ گئے تھے اس جنگ سے۔“  
 ”دیکھا بھائی جان میں نے کہتا تھا۔“ لقمان ڈر کے ہکھلانے لگا۔

”چپ کر چھوٹے۔ یہ نری گیدر بھلیاں ہیں۔ اگر ان کا یہی ارادہ تھا تو کیا انٹھی رکشہ کر کے اپنے لیے مکان پسند کرنے نکلی تھیں۔ میکہ چھوٹے کا ڈر سب

سے بڑا ہوتا ہے عورت ذات کے لیے ویسے بھی یہ جتنا مرضی چھپائیں ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جو محبت ہے اس سے بھلے یہ خود واقف نہ ہوں ان تھوڑے دنوں میں میں میں ضرور واقف ہو گیا ہوں۔“

وہ دونوں خاموش نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ گذرے بیس دنوں کا ایک ایک اذیت ناک لمحہ یاد آنے لگا۔ ایک دوسرے کی تکلیف کی تڑپ محسوس کرنا۔ مگر اسے کم کرنے یا بانٹنے سے معذوری کی بے بسی۔ دل چاہنے کے باوجود کھینچے کھینچے رہنا۔ ہمیشہ کے لیے فاصلے قائم ہونے کا خوف جو ہر وقت سر پہ تلوار کی طرح لٹکا رہتا۔ یہ سب ظاہر کرتے تھے کہ حاتم کے اندازے درست تھے اور اس کا ڈرامہ ایک بروقت عمل۔

”نکی۔“ اکبری نے بانہیں پھیلائیں۔  
 ”وڈی۔“ وہ بھی لپک کے اس کے گلے لگ گئی۔  
 ”یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں عنایت؟“ ابے کی آنکھیں مارے حیرت کے پوری طرح کھل گئیں۔  
 ”اس طرح تو یہ کبھی عید پہ بھی گلے نہیں لگیں۔“  
 ”اس عید پہ ملیں گی“ اس کی ریسرسل ہو رہی ہے۔“ حاتم نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔ ماسی رسولان کا آنگن عید ہے پہلے ہی ”مبارک۔ مبارک۔“ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ

# ایئر ہوسٹس

آپ دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۲۴ دو بازار کراچی